فصلنامہ راہ اسلام

شمارہ : ۱۹۴ - اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۴ء

خانہ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران ۔۱۸، تلک مارگ، نئی دہلی - ۱۱۰۰۰۱
فون: ۲۳۳۸۳۲۳۲، ۳۳، ۳۴
فیکس: ۲۳۳۸۷۵۴۷
http://www.iranhouseindia.com
e-mail:director@iranhouseindia.com

❁ ایڈیٹر، پرنٹر و پبلشر:

جلال تملہ

❁معاونین علمی:

ڈاکٹر علی محمد نقوی

ڈاکٹر اختر مہدی رضوی

❁معاونین فنّی:

❁تزئین کار : مجید احمدی وخانم عائشہ فوزیہ

❁کمپوزنگ : قاری محمد یاسین

❁پریس : اے۔ ایس ٹائپ سیٹر 4903 گراؤنڈ فلور
چاندنی چوک دہلی۔۱۱۰۰۰۶

❁ناشر : خانہ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران
۱۸۔تلک مارگ۔نئی دہلی۔۱۱۰۰۰۱

راہ اسلام میں شائع ہونے والے ہر مقالے کا اسلامی جمہوریہ ایران
کے نظریات کے مطابق ہونا لازمی نہیں ہے۔

.....

فہرست

❁ اداریہ	دو اہم وجانکاہ واقعات	ادارہ	۶
❁ مناسبت	انقلاب اسلامی ایران کی سالگرہ	ڈاکٹر اختر مہدی	۹
❁ عقائد شناسی	خدا کی معرفت	علامہ محمد حسین طباطبائی	۱۷
	توحید شناسی اور جہان شناسی توحید	آیت اللہ شہید بہشتی و شہید باہنر	۳۳
❁ ادیان و مسالک	انسانی حقوق اور نہج البلاغہ	رضا عباس علی گڑھ	۴۷
	اسلامی فرقے	پروفیسر سید جعفر رضا	۳
❁ قرآن شناسی	تفسیر سورہ بقرہ	مولانا سید علی محمد نقوی	۸۵
❁ حدیث شناسی	لوگوں کی معرفت	علامہ محمد رضا حکیمی	۱۰۳
❁ نہج البلاغہ شناسی	حضرت علیؑ اور عصری علوم ومعارف	وصی عقیل زادہ	۱۱۳
❁ تاریخ اسلام	غزوہ احزاب	آیت اللہ جعفر سبحانی	۱۱۸
❁ فرہنگ وتمدن	شیخ الرئیس بو علی سینا	پروفیسر حکیم کلیم الدین حسین صدیقی	۱۳۶
	شیخ الشیوخ حضرت شاہ غلام علی	خانم نکہت فاطمہ	۱۴۸
❁ شعروادب	جشن غدیر	ڈاکٹر محمد تقی علی عابدی	۱۵۵
	کہانی، بیانیہ اور انجمن	عباس رضا نیر	۱۵۹
	تقلید واجتہاد	سید عابد حسین عابد کراروی	۱۸۰
	عرفان غدیر	رضوان بنارسی	۱۸۳

اداریـــــہ:

دو اہم و جاوید واقعات

فصل نامہ ''راہ اسلام'' کا یہ شمارہ ایسے وقت پر شائع ہورہا ہے جبکہ ملت اسلامیہ عالم تاریخ اسلام میں رونما ہونیوالے ان دو اہم واقعات کی یاد منانے میں لگی ہوئی ہے جن کی وجہ سے نہ صرف مذہب اسلام اور مسلمانوں کو نئی زندگی حاصل ہوگئی بلکہ اسلام ومسلمانوں کی عظمت وسربلندی وابدیت وپائندگی کا بیمہ ہوگیا۔

ان میں سے پہلا اہم اور زندہ جاوید واقعہ ۶۱ھ میں کربلا کے میدان میں رونما ہونے والی حسین مظلوم، ان کی اولاد اور ان کے اصحاب و انصار کی جانگداز شہادت پر مشتمل ہے جو ہر سال لوگوں کے دلوں میں اس حسینی راہ وروش کی یاد تازہ کرتی ہے جو ایسے ظالم وناپسندیدہ حکمرانوں کی زور گوئی اور دین سے انحراف کے مقابلے میں اپنائی گئی تھی جو اپنی غیر معمولی طاقت کے نشہ میں اسلامی شریعت کے نام پر جملہ اسلامی مقدسات کا مذاق اڑا رہے تھے اور جن کی ظالمانہ حرکتوں کو دیکھ کر ایسا محسوس ہورہا تھا کہ اب حقیقی اسلام کا خاتمہ قریب آگیا ہے۔ جس حکومت کو اسلامی ارمانات کی تعمیل کی خاطر عدل وانصاف کے معیار کے مطابق قائم ہونا چاہئے تھا وہ قومیت کی بنیاد اور حاکموں کے ناپاک منصوبوں کی بنیاد پر قائم ہوئی تھی اور جس کا عزم و ارادہ وحوصلہ اتنا بلند تھا کہ پیغمبر اکرمؐ کے فرزند عزیز حضرت امام حسین بن علی علیہ السلام سے بھی بیعت کا مطالبہ کرڈالے اور حسین مظلوم جیسی عظیم شخصیت کو بھی اپنی ظالم اور منحرف حکومت کے سایہ میں زندگی بسر کرنے کے لئے مجبور کردینا چاہے۔ ان ظالم حکمرانوں کے مطالبۂ بیعت پر حسین مظلوم نے جو دندان شکن اور گرانقدر جواب دیا تھا وہ تاریخ کے

صفحات میں ہمیشہ کے لئے ثبت ہے کہ اے یزید! کیا اپنے زعم ناقص میں تو نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ خانوادہ نبوت وطہارت سے وابستہ مجھ جیسا انسان تجھ جیسے شرابی اور دین مبین اسلام سے منحرف شخص کی بیعت قبول کرے گا۔ "ھیھات من الذلہ" یعنی افسوس! ذلت کی زندگی سے عزت کی موت بہتر ہے۔ اپنے اس تاریخ ساز نعرہ کے سایہ میں وہ اپنے وفادار اصحاب کے ہمراہ قربان گاہ کربلا کی طرف بڑھتے چلے گئے اور ایک امام کی حیثیت سے جن کا ہر عمل حقیقی عقیدہ کا عملی رنگ وروپ ہوا کرتا ہے اور جن کے اعمال کی روشنی میں باطل کی بے راہ روی کی نشاندہی ہوجاتی ہے۔ ان کی اس شجاعانہ تحریک سے نہ صرف ظالموں کے حوصلے پست ہوگئے بلکہ ان کا انحراف پوری طرح ظاہر ہوگیا اور خدا کا دین ابدی زندگی سے مالامال ہوگیا۔ حسین مظلوم کی یہ روش صرف مسلمانوں کے درمیان ہی نہیں بلکہ غیرمسلموں کے درمیان بھی اس حد تک مقبول ہوئی کہ آج ان کا یہ قول ایک محاورہ کی حیثیت سے ہر خاص وعام کی زبان سے جاری ہے اور ہر آزادی طلب انسان یہ کہتا ہوا نظر آتا ہے کہ ذلت کی زندگی سے عزت کی موت بہتر ہے۔ اور بڑے وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ یہ حسینی روش آنے والی نسلوں کے درمیان میں بھی مقبول رہے گی۔ حسین ابن علی علیہ السلام اور ان کے اصحاب وانصار پر ہمارا لاکھوں سلام۔ یقیناً یہ لوگ اسلام کے دھڑکتے ہوئے دل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اس سلسلے کا دوسرا واقعہ انقلاب اسلامی ایران کی کامیابی سے وابستہ ہے جو درحقیقت حسین مظلوم کی زندہ جاوید تحریک کے درخشاں نتائج میں سے ایک ہے۔

امام خمینیؒ کی قیادت میں اسلامی انقلاب ایسے وقت میں رونما ہوا جبکہ عالمی تعلقات کے مختلف شعبوں میں دین ومذہب کو مناسب درجہ ومقام حاصل نہ تھا اور بین الاقوامی توازن میں دین کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ عالمی سطح پر اگر چہ مسلمانوں کی آبادی کچھ کم نہ تھی اور وسائل وامکانات کے اعتبار سے بھی یہ قوم پوری طرح مالامال تھی لیکن ان پر دو بڑی طاقتوں کا غیر معمولی دباؤ قائم تھا اور ایرانی حکومت قوم مغرب کے ظالمانہ مفاد ومصالح کی حفاظت میں نہ

صرف ایک مسلح چوکیدار کا کام انجام دے رہی تھی بلکہ گرانقدر وعظیم ثقافتی میراث سے مالامال ایرانی حکومت علاقائی اسلامی ممالک کے خلاف غاصب صیہونی اسرائیلی حکومت کے دفاع میں بھی سرگرم تھی۔

اسلامی انقلاب نے اپنی عظیم الشان کامیابی کے بعد عالمی روابط کے توازن کو درہم برہم کردیا اور بین الاقوامی سطح پر ازسرنو تشکیل پانے والے عالمی تعلقات میں دین کو خصوصی اہمیت کا حامل بنادیا۔ اس انقلاب نے ایران کو پوری طرح مستقل اور مظلوموں کا طرفدار بنادیا اور مسلمانوں کو ایسی عزت وعظمت عطا کردی کہ اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد برسوں گزر گئے لیکن آج بھی اس ملک میں جو حکومت قائم ہے وہ ایسی دینی حکومت ہے جس میں عوام کو غیرمعمولی فضیلت حاصل ہے اور ملک کے سیاسی، اقتصادی، سماجی اور ثقافتی شعبوں میں مسلمانوں کا اثر ورسوخ روز بروز بڑھتا جارہا ہے اور یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہے گا تاوقتیکہ امت اسلامیہ اپنی حقیقی عزت وعظمت کو حاصل کرنے میں ہمہ تن کامیاب ہوجائے۔ اسلامی انقلاب کی راہ وروش درحقیقت ہر اعتبار سے حسینی روش ہے جس میں ناجائز تسلط اور دباؤ کا ڈٹ کر مقابلہ کیا گیا ہے اور اس انقلاب نے عالمی معاملات ومسائل کو حل کرنے کے لئے طاقت واسلحہ کے استعمال کے بجائے قوموں اور ثقافتوں کے درمیان گفتگو کی تجویز پیش کی ہے اورعدل وانصاف پر مبنی صلح وسلامتی کی خاطر اتحاد کی دعوت دی ہے جس کا دنیا کے اکثر ملکوں نے کھلے دل سے استقبال کیا ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ دنیا کے مسلمان ہی نہیں بلکہ زیادہ سے زیادہ انصاف پسند اور صلح دوست افراد امام حسین علیہ السلام کی راہ وروش سے مکمل واقفیت وآگاہی حاصل کرتے ہوئے اس کی بھرپور پیروی کے ذریعہ اس دنیا کو فریب وظلم سے دور رکھنے میں ہر ممکن تعاون سے کام لیں گے اور خداوند عالم کے رحم وکرم کے سایہ میں دنیائے بشریت کو مہلک اسلحوں سے نجات فراہم ہوجائے گی۔

☆☆☆☆

از: ڈاکٹر اختر مہدی
جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

انقلاب اسلامی ایران کی ۲۶ ویں سالگرہ

۱۱فروری ۲۰۰۵ء انقلاب اسلامی ایران کی کامیابی کی ۲۶ ویں سالگرہ کا دن ہے درحقیقت یہ ایران کے اس عوامی اور اسلامی انقلاب کی کامیابی کی یاد تازہ کرتا ہے جس کے سایہ میں حق نے باطل پر، خون نے شمشیر پر اور ملک کے خالی ہاتھ عوام نے مسلح شاہی افواج پر ایسی عظیم الشان کامیابی حاصل کی تھی جس کی مثال تاریخ کے صفحات میں کہیں نہیں ملتی۔ اس انقلاب کے دوران ملک کے نہتھے مجاہدوں نے اپنے مثالی ایثار وجہاد کے ذریعہ پوری دنیا کو حیرت میں ڈال دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ڈھائی ہزار سالہ شاہی حکومت نابودی کے گڑھے میں ایسی لڑھکی کہ اس کا نام ونشان بھی باقی نہ رہ گیا اور جس کی عظیم الشان کامیابی کے فوراً بعد ہی قائد انقلاب اسلامی حضرت امام خمینیؒ نے بڑی قاطعیت کے ساتھ حکومت کے خدوخال اور رنگ وروپ کو ان الفاظ کے ساتھ واضح کردیا۔ ''فقط جمہوری اسلامی، نہ یک حرف کم ونہ یک حرف زیاد۔'' اور استصواب عامہ کے دوران فرزندان توحید نے اپنی بھرپور حمایت کے ذریعہ ساری دنیا پر یہ ثابت کردیا کہ ان کے قائد عظیم الشان کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ پتھر کی لکیر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے ملک کا بچہ بچہ امام خمینیؒ کے اس قول کو عملی جامہ پہنانے میں سرگرم ہوگیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس عظیم اسلامی حکومت کی تشکیل عمل میں آگئی جس میں حاکیت مطلقہ تو پروردگار عالم کے ہاتھ میں ہوا کرتی ہے اور باہمی مشاورت کے ذریعہ قانون کے نفاذ کا کام انجام پاتا ہے۔ اسلامی جمہوریت میں مادی ترقی کو عظمت

ومر بلندی کا منارہ نہیں قرار دیا گیا اور اسی طرح اقتصاد کو مقصد حیات نہیں بلکہ وسیلۂ حیات تسلیم کیا گیا ہے اور قرآن مجید میں مندرج الٰہی قوانین اور سیرت پیغمبر کی بنیاد پر ملک کے آئین کی تدوین انجام پاتی ہے جس میں دنیائے بشریت کی کسی عظیم طاقت یا شخصیت کی غلامی کے بجائے قادر مطلق کی بندگی اور سیرت رسول کی پیروی کو نمایاں اہمیت حاصل ہے اور جس کے بموجب ملک کا ہر باشندہ اپنے ہر قول و عمل کے لئے بارگاہ عالیہ خداوندی میں جوابدہ ہے۔

درحقیقت انسانی عقل حیران ہے کہ خمینیؒ جیسا عالم دین ایک نامور سیاست داں کیسے بن گیا جس نے نہ یورپ کی کسی یونیورسٹی سے کوئی خصوصی سند حاصل کی اور نہ دنیا کے کسی ماہر سیاست کی پیروی انجام دی بلکہ اس کے بالکل برعکس انھوں نے دینی مدرسہ و مکتب کے ماحول میں آنکھ کھولی تھی اور کسی شاہی محل کے بجائے مسجد کے حجرے میں پرورش پائی تھی اور مسجدوں کے پاکیزہ ماحول میں انھوں نے پاکیزگی نفس کی منزلیں طے کی تھی اور اپنے نفس کو دنیا کی تمام آلودگیوں سے پاک رکھا تھا۔ ان کا عقیدہ وایمان تھا کہ مذہب اور سیاست کے درمیان علیحدگی درحقیقت اسلام دشمن سازش کا نتیجہ ہے۔ انھوں نے اپنے عملی نمونوں کے ذریعہ ان لوگوں کے ذہنوں کی پاکیزگی کا کارنامہ انجام دیا جن کے ہاتھوں میں ملک کی سیاسی باگ ڈور دینی تھی واضح رہے کہ اگر ماہرین سیاست اپنے ذہنوں کو ہر ممکن بدعنوانیوں اور آلودگیوں سے دور رکھیں تو سیاست عین عبادت بن جائے گی اور مسلمان رہبانیت سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہوئے ملک کے جملہ سیاسی امور میں اسی طرح دلچسپی لے گا جس طرح وہ مذہبی امور میں سرگرم رہا کرتا ہے۔شاید یہی وہ عظیم مقاصد تھے جن کی وجہ سے اوائل انقلاب میں جب فرانسیسی اخبار کے نمائندوں نے ان سے یہ کہا کہ ”خمینی صاحب ! لوگوں کا یہ خیال ہے کہ آپ کے اس انقلاب نے ایران کو پسماندہ، ملک میں تبدیل کردیا ہے اور یہ ملک ترقی کے میدان میں پچاس سال پیچھے چلا گیا ہے۔“ امام خمینی نے اس بے بنیاد الزام پر کسی ناراضگی کا مظاہرہ کئے بغیر فرمایا۔ ”میرے دوست ! میں ایران کو چودہ سو برس پیچھے لے جانا چاہتا ہوں تاکہ ترقی کو اسلامی

اور انسانی معیارو اقتدار کی کسوٹی پر پرکھا جاسکے۔'' اسی طرح جب نامور عالمی صحافیوں نے ان سے یہ پوچھا کہ ''خمینی صاحب ! چلئے ٹھیک ہے۔ یہ تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ آپ اپنی زندگی تک ایران کو اسلامی تعلیمات کا پیرو بنائے رکھیں گے لیکن آپ کے بعد کیا ہوگا؟ '' آپ نے غیر معمولی متانت اور سنجیدگی کے ساتھ جواب دیتے ہوئے کہا تھا'' اسلام میں شخصیت پرستی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ایران کے اسلامی ماحول اور مقدس تعلیمات عالیہ الٰہیہ کی آغوش میں پرورش پانے والا اس ملک کا ہر بچہ خمینی ہے۔'' اگر ان کے منہ سے نکلے ہوئے اس جملے کی تعریف اس وقت کی جاتی تو یقیناً اس میں خوشامد پسندی اور لابہ گری کے عنصر تلاش کئے جاسکتے تھے لیکن آج ان کی وفات کے بعد تقریباً پندرہ سال کا طویل عرصہ گزر چکا ہے لیکن ایران اپنی خالص اسلامی اور انسانی سیاست پر کوہ ہمالیہ کی طرح اٹل دکھائی دیتا ہے اور ایرانی رہنماؤں کے ثبات قدم میں ذرہ برابر لغزش نظر نہیں آتی بلکہ اس ملک کے ہر بچہ کی زبان سے یہی جملہ سنائی دے رہا ہے۔'' امام خمینی کے نام کے بغیر دنیا کے کسی علاقے میں بھی اس انقلاب کی کوئی شناخت نہیں ہے۔''

بہر حال اسلامی انقلاب کی سالگرہ کے موقع پر اس کی اہمیت وافادیت کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے یہ لازمی معلوم ہوتا ہے کہ اس انقلاب سے قبل رائج حالات کا مختصر تجزیہ بھی پیش کردیا جائے۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ ۱۹۷۹ء میں دنیا دو بڑی طاقتوں کے درمیان بٹی ہوئی تھی۔ ان میں سے ایک جماعت مشرقی بڑی طاقت کے سایہ میں زندگی بسر کررہی تھی جن کی باگ ڈور سابقہ سوویت یونین(USSR)کے ہاتھوں میں تھی اور دنیا کے باقی ممالک مغربی بڑی طاقت کے دست نگر تھے جس کی باگ ڈور امریکہ کے ہاتھوں میں تھی۔مشرقی بڑی طاقت اشتراکی نظام حکومت کی پیرو اور مغربی بڑی طاقت سرمایہ دارانہ نظام کی علمبردار تھی اور دنیا کے اکثر ملکوں میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ حقیقی استقلال کی لذتوں سے لطف اندوز ہوپاتے۔ ایران میں شاہی حکومت قائم تھی اور یہ حکومت پوری طرح امریکہ کی غلامی میں سرگرم تھی بلکہ صرف ایران میں ہی نہیں بلکہ اس پورے علاقے میں امریکی مفاد کی نگہبانی کرنا سابقہ ایرانی حکومت

کا فریضہ تھا۔ سرکاری اعتبار سے دیکھا جائے تو شاہی حکومت کے زمانہ میں بھی ایران کا سرکاری مذہب اسلام تھا اور عقیدہ کے اعتبار سے حکومت شیعہ اثنا عشری عقائد کی پیروی کا مظاہرہ کیا کرتی تھی ۔ لیکن عملی اعتبار سے شاہی حکومت کے زمانہ میں ایران میں اسلام ایک قصۂ ماضی کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ اسلامی حجاب کے نام پر با حجاب خواتین کے سر سے ان کی چادریں چھین لی جاتی تھیں اور مٹھی بھر شاہی اور درباری علماء کے علاوہ ملک کے نامور علماء دین کو بڑی حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ مغربی رعنائیوں کے سایہ میں اپنے وجود سے غافل ایرانی معاشرہ غفلت کی نیند سو رہا تھا انسانی حقوق کی حفاظت اور خواتین کی آزادی کے نام پر جگہ جگہ ایسی فحش محفلوں کا شاندار اہتمام دکھائی دیتا تھا جس سے اسلام کی جھلک تک محسوس نہ کی جا سکے۔ ملک کی اقتصادی شہ رگ پر شاہ اور اس کے مٹھی بھر ساتھیوں کا قبضہ تھا۔ مختصر لفظوں میں تہران سے پیرس کی جھلک محسوس ہوتی تھی۔ ایرانی مسلمان تفرقہ واختلاف کی آگ میں جھلس رہا تھا اور اکثر علماء پر شاہی حکومت کی جلادانہ سرگرمیوں کا رعب ودبدبہ طاری تھا اور ملا کی دوڑ مسجد کی چہار دیواری تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔

ایسے ناگفتہ بہ ماحول میں وطن سے ہزاروں میل دور رہتے ہوئے بھی امام خمینیؒ نے انقلاب اسلامی ایران کی ایسی رہنمائی کی کہ رضا شاہ کو ایران چھوڑ کر بھاگنا پڑا اور امام خمینیؒ ہر طرح کی خفیہ واعلانیہ دھمکیوں کے باوجود غیر ملکی جہاز پر سوار ہو کر پہلی فروری کو ایران آ گئے۔ عالمی ذرائع ابلاغ عامہ کے ذریعہ یہ شبہ بھی ظاہر کیا جا رہا تھا کہ ممکن ہے وہ طیارہ جس پر خمینیؒ سوار ہیں وہ کسی دھماکہ خیز سانحہ کا شکار ہو جائے لیکن اپنے مشاورین کی اطلاعات کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے ہجرت پیغمبر کی رات پیغمبر کے بستر پر آرام سے سونے والے علی کی پیروی کرنیوالے امام خمینیؒ تہران کے لئے روانہ ہو گئے اور مکمل اعتماد کے ساتھ انھوں نے اپنے وطن کی خاک پر دوبارہ قدم رکھا اور کسی قسم کی ہچکچاہٹ کے بغیر یہ اعلان کرنے میں ذرہ برابر تاخیر نہیں کی ایران میں ایسی اسلامی جمہوری حکومت قائم ہوگی جس کا مشرقی یا مغربی بڑی طاقت سے

کوئی سروکار نہ آئے گا بلکہ یہ حکومت قرآن وسنت پر مشتمل ایرانی آئین کی پیرو ہوگئے۔ دین اور سیاست میں کوئی علیحدگی نہ ہوگی بلکہ سیاسی حکمراں دینی اصول وعقائد کی پیروی کے پابند ہوں گے۔ مختصر لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسلامی حکومت کے سایہ میں زندگی بسر کرنے والوں کو غیر اسلامی حرکتوں کی اجازت نہ دی جائے گی۔ اسلام نے عورتوں کو جو مساوی حقوق عطا کئے ہیں وہ انھیں باقاعدہ فراہم کئے جائیں گی۔صرف مسلمانوں کے درمیان اتحاد ہی نہیں بلکہ انسانی اتحاد جیسے مشن میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد وحدت انسانی کی راہ میں عملی قدم اٹھائے جائیں گے اور ایران میں موجود کسی بھی سیاسی یا سماجی تنظیم یا جماعت کو غیر ملکی اشاروں پر رقص کرنے کی اجازت نہ ہوگی۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا اور امام خمینیؒ نے یکے بعد دیگرے اپنے اسلامی منصوبوں کو عملی جامہ پہنانا شروع کردیا لیکن یہ کوئی آسان کام نہ تھا کہ دنیا کی تمام بڑی طاقتوں کی دشمنی مول لینے کے بعد ایران پرسکون ماحول میں زندگی بسر کرسکے۔ چنانچہ ان بڑی طاقتوں نے مہلک اسلحوں کی فراہمی کے ساتھ صدام کو ایران پر حملہ کرنے کے لئے راضی کرلیا اور جنگ کی ایسی آگ بھڑکائی جو آٹھ سال تک جاری رہی لیکن اس جنگ سے ایرانی حکومت کے حوصلوں میں کوئی کمی نہیں آئی بلکہ روز بروز ان کے حوصلے بلند ہوتے رہے۔ اسلامی تعلیمات کی بنیاد پر ہی ایران نے فلسطین کی حمایت کا اعلان کیا۔ اسرائیل سے اپنے تمام تعلقات توڑ لئے۔جس عمارت میں اسرائیلی سفارت خانہ قائم تھا اس میں فلسطینی سفارت خانہ قائم ہوگیا تفرقہ واختلاف ملکی اور عالمی سطح پر مذہب اسلام کی مختلف شاخوں کے درمیان اتحاد کا ماحول پیدا کیا اور ایران میں اس مسئلہ تفرقہ واختلاف کو ہمیشہ کے لئے دفن کردیا گیا۔ اسلامی حجاب کی پیروی کے ساتھ ایران کی اسلامی جمہوری حکومت نے ایرانی خواتین کو ان کے جملہ جائز حقوق سے مالامال کردیا۔ چنانچہ آج ایران میں یونیورسٹیوں، کالجوں اور اسکول میں درس حاصل کرنے والے طلبا کے درمیان خواتین کی اکثریت ہے اور زندگی کے ہر شعبہ میں ایرانی خواتین دن دونی رات چوگنی ترقی کر

رہی ہیں۔

داخلی سطح پر ہر شعبہ میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے والے انقلاب اسلامی ایران نے عالمی اور بالخصوص اسلامی دنیا سے جڑے ہوئے مسائل کو حل کرنے میں بھی مثبت اور نمایاں کردار ادا کیا ہے چاہے وہ اسلامی کانفرنس تنظیم کی قیادت کا میدان ہو یا کویت سے حملہ آور عراقی افواج کی غیر مشروط اور فوری واپسی کی بات، ایران کی اسلامی جمہوری حکومت نے اپنی مخصوص راہ و روش کی پیروی کی ہے جو اسلامی اصول وقوانین کے مطابق ہو۔ علاقائی اور عالمی سطح پر ہونے والے عظیم اجتماعات کے دوران بھی اس انقلاب اسلامی کی تبلیغ کرنے والوں ہر موڑ پر حق کی حمایت کرتے ہوئے باطل کی اعلانیہ مخالفت اور اس سے اپنی بیزاری کا اعلان بھی کیا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب جوہری بم کی تولید اور مہلک اسلحوں کی فراہمی کی عالمی دوڑ کا سلسلہ شروع ہوا اور عالم بشریت پر ہلاکت ونابودی کے بادل چھانے لگے اور عالمی سطح پر تہذیبوں کے درمیان ٹکراؤ کی تھیوری کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اسلام کی نابودی اور مسلمانوں کے قتل عام کی سازش کا جال پھیلایا جانے لگا اور اسلام ومسلمانوں کو دہشت گردی سے جوڑتے ہوئے مقدس اسلامی فرائض مثلاً جہاد اور شہادت کو بدنام کرنے کا سلسلہ شروع ہوا تو مباہلہ پر مبنی سیرت نبوی کی پیروی کرتے ہوئے دنیا کے واحد اسلامی جمہوری ملک ایران کے صدر حجت الاسلام محمد خاتمی نے اقوام متحدہ کے اجلاس میں یہ مطالبہ پیش کیا کہ اکیسویں صدی کے پہلے سال ۲۰۰۱ء کو ''تہذیبوں کے درمیان گفتگو'' کا سال قرار دیا جائے۔ یہ مطالبہ اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام صلح وسلامتی اور مذاکرہ وگفتگو کے ذریعہ مسائل کے حل کا طرفدار ہے۔ کل پیغمبر اکرمؐ نے جگہ جگہ پر عیسائیوں اور یہودیوں کو مذاکرہ وگفتگو کی دعوت دی تھی آج ان کی سیرت دنیائے بشریت کو یہ پیغام دے رہی ہے کہ ٹکراؤ کا انجام نابودی اور گفتگو کا انجام صلح وسلامتی ہے۔ اسی طرح انسانی حقوق کی حفاظت وبحالی کے سلسلے میں اسلامی جمہوریہ ایران کے حکمراں کوفہ کے گورنر مالک اشتر کے نام جاری کئے گئے اس علوی فرمان کو نمونہ عمل بنائے

ہوئے ہیں جس میں آپ نے ارشاد فرمایا تھا۔'' اے مالک ! تمہاری حکومت میں دو طرح کے لوگ ہیں۔ ان میں سے ایک تمہارے ایمانی بھائی ہیں جو تمہارے ہم مسلک و ہم عقیدہ ہیں اور دوسرے تمہارے انسانی بھائی ہیں۔ اور تمہیں دونوں کا خیال رکھنا ہے۔ پس تم ان کی غلطیوں کو اس طرح نظر انداز کر دینا جیسے تم خطاؤں کے سلسلے میں اپنے مالک وخالق سے عفو ومعافی کے طلبگار ہو۔''

بہرحال انقلاب اسلامی ایران اپنی زندگی کے ۲۶ سال پورے کرچکا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ انقلاب فرانس کے بعد اس انقلاب کو دنیائے بشریت کا سب سے بڑا واقعہ کہا جاسکتا ہے جس نے صرف مسلمانوں کی نہیں بلکہ کمزور طبقہ کے لوگوں اور حق پسندوں کی بھرپور حوصلہ فزائی کی ہے اور ۲۶ سال کی اس لمبی مدت کے دوران یہ انقلاب جن صبر آزما مراحل سے گزرا ہے اسکو نگاہ میں رکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس انقلاب کو تائید الٰہی حاصل رہی ہے۔ لیکن اس انقلاب عظیم کی ۲۶ ویں سالگرہ کے موقع پر ایران کے خلاف امریکہ اور اسرائیل کی حالیہ دھمکیوں کی طرف اشارہ کئے بغیر اس مقالہ کی تکمیل قدرے ناانصافی معلوم ہوتی ہے اور فوجی کاروائی اور ممکنہ حملے کی دھمکی اس انقلاب کے لئے کوئی نئی بات نہیں معلوم ہوتی ہے۔ واضح رہے کہ بات نہیں رہ گئی ہے بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ایران میں امریکی ناکہ بندیوں اور دھمکیوں کے سایہ میں سانس لینے والے لوگوں کی ایک جوان نسل تیار ہوگئی ہے اور ذاتی دفاع ونظام دنیا کے ہر انسان کا بنیادی حق ہے لیکن یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ یہ دھمکیاں ایسے وقت میں دی جارہی ہیں جبکہ ایرانی عوام اپنے عوام اسلامی انقلاب کی سالگرہ کے ساتھ ہی ساتھ اس ماہ محرم کے استقبال کی تیاری میں بھی سرگرم ہیں جس کے بارے میں اسلامی انقلاب کے قائد عظیم الشان امام خمینی ایران قوم کو یہ بتا کر گئے ہیں کہ ''یہ اسلامی انقلاب محرم کا عطیہ ہے۔تمہارے پاس جو کچھ ہے وہ حسین مظلوم کی قربانی کا سرمایہ ہے اور اگر حق وباطل کے درمیان ٹکراؤ کی صورت ہوتو ہر زمین سرزمین کربلا اور ہر روز روز عاشورہ ہے۔ اور اس پیغام کی آفاقیت کا اندازہ

اس بات سے لگایا جاسکتا ہے پوری دنیائے بشریت کی ہدایت کی ذمہ داری کے ساتھ نازل ہونے والی مقدس کتاب قرآن مجید یہ اعلان کررہا ہے کہ ”خدا کی راہ میں قتل ہونے والوں کو مردہ سمجھنا بلکہ وہ لوگ زندہ ہیں اور اپنے پروردگار کی بارگاہ سے رزق حاصل کرتے ہیں۔“ آج دشمن بھی معترف ہے کہ ایران اسلام کی راہ پر گامزن ہے اور یہی راہ اسلام وراہ حق ہے۔

علامہ محمد حسین طباطبائی

عقائد شناسی

خدا کی معرفت و ضرورت
کائنات کے ابدی حقائق کی روشنی میں

احساس اور ادراک جو انسان کی ہستی میں ایک دوسرے سے گندھے ہوئے ہیں، اپنی ماہیت سے اللہ اور کائنات کی ہستی کو نمایاں کرتے ہیں کیونکہ یہ بات ان لوگوں کے نظریہ کے برعکس ہے جو خود اپنی اور دوسری چیز کی ہستی کے بارے میں شک کرتے ہیں اور دنیا کو فریب اور دھوکہ سمجھتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ جب انسان پیدا ہوتا ہے وہ احساس اور ادراک کا مالک ہوتا ہے اور اپنے آپ کو اور دنیا کو جان لیتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اسے اس بارے میں کوئی شک نہیں ہوتا کہ وہ موجود ہے اور دوسری چیزیں بھی موجود ہیں۔ جب تک انسان، انسان ہوتا ہے یہ شعور اور علم اس میں موجود ہوتا ہے اور اس کے بارے میں نہ کوئی شک کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس میں کوئی تبدیلی ہوتی ہے۔

اس حقیقت اور ہستی کا ادراک جس کی انسان سوفسطائیوں اور شکی مزاج لوگوں کے نظریات کے برعکس اپنی عقل کے ذریعے تائید کرتا ہے ناقابل تغیر ہے اور اسے کبھی بھی باطل ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ دوسرے لفظوں میں انسان کی اپنی ہستی کی بنا پر سوفسطائیوں اور شکی مزاج لوگوں کا دعویٰ، جو حقیقت کی نفی کرتا ہے، کبھی بھی درست نہیں ہوسکتا۔ اس وسیع کائنات میں ایک مستقل اور جاودانی حقیقت ہے جو اس کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور وہ اپنے آپ کو عقل کے سامنے ظاہر کرتی ہے۔ تاہم اس دنیا کا ہر مظہر جو ایک ایسی حقیقت کا حامل ہوتا ہے جسے ہم حساس اور باشعور انسان کی حیثیت سے جانتے ہیں، جلد یا دیر، اپنی حقیقت کھو بیٹھتا ہے اور معدوم ہوجاتا

ہے۔ اس امر سے واضح ہوجاتا ہے کہ مرئی دنیا اور اس کے مختلف حصے حقیقت کا جوہر نہیں ہیں (جو کبھی بھی محو یا معدوم نہیں ہوتا) دراصل وہ ایک ابدی حقیقت کے محتاج ہیں جس کے ذریعہ وہ اپنی حقیقت اور وجود حاصل کرتے ہیں۔ جب تک وہ اس ابدی حقیقت سے وابستہ رہتے ہیں وہ ہستی کے حامل ہوتے ہیں اور جیسے ہی ان کا رشتہ اس سے ٹوٹ جاتا ہے وہ معدوم ہوجاتے ہیں۔ہم اس ناقابل تغیر لازوال اور واجب الوجود حقیقت کو اللہ تعالیٰ کہتے ہیں۔

انسان اور کائنات کا باہمی رابطہ:

اس سے قبل اللہ تعالیٰ کی ہستی ثابت کرنے کے لئے ہم نے جس راستے کا انتخاب کیا تھا وہ ایک سیدھا سادہ اور واضح راستہ ہے جس پر انسان اپنی خداداد فطرت اور ذہانت کے ساتھ کسی الجھن کے بغیر گامزن ہوتا ہے لیکن چونکہ لوگوں کی اکثریت اپنے دنیاوی دھندوں میں مصروف اور حسی مسرتوں میں مگن ہے لہٰذا اس کے لیے اپنی خداداد، سادہ، بنیادی اور پاکیزہ فطرت کی جانب لوٹنا بہت مشکل ہوگیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے، جو ایک آفاقی اور سب کو برابر سمجھنے والا دین ہے، ایسے اشخاص کے لیے اللہ تعالیٰ کی ہستی ثابت کرنے کے لیے ایک اور راستے کا حصول ممکن بنادیا ہے۔ یہ ان لوگوں سے اسی راستے سے کلام کرتا ہے اور اللہ سے روشناس کراتا ہے جو اپنی سادہ اور بنیادی فطرت سے ہٹ گئے ہیں۔قرآن مجید نوع انسان کو مختلف طریقوں سے معرفت الٰہی کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ بالخصوص انہیں دنیا کی تخلیق اور اس پر حاوی نظام کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ وہ انہیں دعوت دیتا ہے کہ وہ موجودات دنیا اور ''اپنے نفسوں'' کے بارے میں غور وفکر کریں[۱] کیونکہ اپنی چند روزہ دنیاوی زندگی میں انسان خواہ کوئی راستہ اختیار کرے یا کسی حالت میں بھی ہواسے عالم ہستی یا اس پر حاوی نظام سے باہر نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی عقل اور قوت ادراک آسمان اور زمین کے ان عجیب وغریب نظاروں کو نظر انداز نہیں کرسکتی جن کا وہ مشاہدہ کرتا ہے۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں یہ وسیع عالم ہستی جو ہماری نگاہوں کے سامنے پھیلا ہوا ہے،

پورے کا پورا اور اس کے تمام اجزا مسلسل تغیر وتبدل کی حالت میں ہیں۔ یہ ہر لحظہ اپنے آپ کو ایک نئی اور انوکھی شکل میں پیش کرتا ہے۔ یہ ان قوانین کے زیر اثر حقیقت کا روپ اختیار کرتا ہے جن میں کوئی استثناء نہیں۔ بعید ترین کہکشاؤں سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے ذروں تک جو اس کائنات کے اجزاء ہیں مخلوق کا ہر حصہ ایک اندرونی نظام رکھتا ہے جو حیرت انگیز طریقے پر ایسے قوانین کے تحت چلتا ہے جن میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں۔ دنیا اپنا دائرہ کار پست ترین حالت سے کامل ترین حالت تک وسیع کرتی ہے اور خود اپنے کمال کی منزل تک پہنچتی ہے۔

ان نظاموں سے بالا تر زیادہ عالمگیر نظام ہیں اور بالآخر مجموعی کائناتی نظام ہے جو دنیا کے لاتعداد حصول کو یکجا کرتا ہے اور مخصوص نظاموں کو ایک دوسرے سے مربوط کرتا ہے۔ یہ نظام مسلسل جاری ہے اور کسی استثناء یا خلاف ورزی کی اجازت نہیں دیتا۔

تخلیق کا نظام ایسا ہے کہ مثال کے طور پر اگر وہ کسی شخص کو زمین پر وارد کرتا ہے تو اسے ایسی بناوٹ عطا کرتا ہے کہ وہ اپنے ماحول میں خوش اسلوبی سے رہ سکے۔ وہ ماحول کو ایسے سانچے میں ڈھالتا ہے کہ انسان کی پرورش ایک مہربان دایہ کی طرح کی جاسکے۔ سورج چاند، ستارے، پانی، زمین، رات، دن، سال کے مختلف موسم، بادل، ہوا، بارش، زمین کی سطح پر بکھرے ہوئے اور اس کے اندر چھپے ہوئے خزانے ہی نہیں بلکہ فطرت کی تمام قوتیں اس شخص کی بہبود اور تسکینِ خاطر کے لیے سرگرم عمل ہوجاتی ہیں۔ اس قسم کی یگانگت اور ہم آہنگی مظاہر کے درمیان اور خود اس کے گھر میں موجود ہوتی ہے۔

اس قسم کا تسلسل اور ہم آہنگی دنیا کے ہر مظہر کی اندرونی ساخت میں بھی پائی جاتی ہے۔ اگر نظام تخلیق نے انسان کو خوراک عنایت کی ہے تو اسے وہ خوراک تلاش کرنے کے لیے پاؤں، پکڑنے کے لیے ہاتھ، کھانے کے لیے منہ اور چبانے کے لیے دانت دیے ہیں۔ اس نے متعدد ذریعوں سے جو ایک زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک دوسرے سے وابستہ ہیں انسان کو تخلیق کے آخری مقصد سے منسلک کر دیا ہے جس کو بقا اور کمال کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

بہت سے سائنسدانوں کو اس بارے میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے ہزاروں سال کی کاوش کے بعد مختلف اشیاء کے مابین جو لاتعداد تعلقات ظاہر کیے ہیں وہ کائنات کے اسرار اور ان کی بے شمار پیچیدگیوں کی ابتدائی کیفیت کے محض ادنیٰ نمونے ہیں۔ ہر نیا انکشاف انسان کو لاتعداد نامعلوم عناصر کی موجودگی کی خبر دیتا ہے۔ کیا کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ وسیع کائنات، جس کے مختلف حصے علیحدہ اور مجموعی طور پر اور ایک دوسرے سے باہمی تعلقات کی بنا پر لامتناہی علم اور قوت کا پتہ دیتے ہیں، کسی خالق کے بغیر اور بلا وجہ پیدا ہوگئی ہے؟ اور کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ مخصوص اور عالمگیر نظام اور پھر یہ پورا کائناتی نظام جس نے، کہ کیوں باہمی تعلقات پیدا کر کے کائنات کو ایک وحدت کی شکل دے رکھی ہے، کسی منصوبے اور تدبیر کے بغیر محض اتفاق سے وجود میں آگئے ہیں؟ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ کائنات کے مظہر نے وجود میں آنے سے پہلے اپنے لیے ایک نظام اور ایک قانون کا انتخاب کرلیا تھا جس پر وہ وجود میں آنے کے بعد عمل درآمد کرتا ہے؟ یا کوئی یہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ یہ دنیا، جو ایک وحدت ہے اور جس کے اجزاء میں مکمل یگانگت، ہم آہنگی اور وابستگی پائی جاتی ہے، مختلف ذرائع سے دیے گئے مختلف احکام کے نتیجے میں وجود میں آئی ہے؟

ظاہر ہے ایک باشعور انسان جو ہر واقعے اور مظہر کا رشتہ ایک سبب سے جوڑتا ہو اور جو بعض اوقات ایک ایسا سبب دریافت کرنے کے لیے، جس کا اسے علم نہ ہو، کافی تحقیق اور تفتیش کرتا ہو کبھی بھی یہ باور نہیں کرسکتا کہ دنیا ایک ایسی ہستی کے بغیر جو اس کا سبب ہو خود بخود پیدا ہوگئی ہو۔ ایسا شخص جب چند اینٹوں کو ایک دوسری ترتیب سے رکھے دیکھتا ہے تو سمجھ جاتا ہے کہ یہ کسی علم اور قوت کے حامل شخص نے رکھی ہیں اور ان کا پہلے سے طے شدہ کوئی مقصد ہے لہٰذا وہ کائنات کے وسیع نظام کو محض اتفاق کا نتیجہ نہیں سمجھ سکتا۔

دنیا پر حاوی نظام کے گہرے مطالعہ سے پتہ چل جاتا ہے کہ یہ دنیا اور اس کا نظام ایک قادر مطلق نے پیدا کیا ہے جو لامحدود علم اور طاقت رکھتا ہے اور اس دنیا کی رہنمائی ایک

مقصد کی جانب کرتا ہے وہ جزوی اسباب جو دنیا میں انفرادی واقعات وجود میں آتے ہیں بالآخر اسی تک پہنچ کر اختتام پذیر ہوتے ہیں۔ وہ ہر لحاظ سے اسی کے زیر تسلط ہوتے ہیں اور اسی کی دانش سے ہدایت پاتے ہیں۔ ہر موجود اس کا محتاج ہے جبکہ وہ کسی کا محتاج نہیں اور کسی طرح کے اسباب یا حالات کا سہارا نہیں لیتا۔

خداوند کریم فرماتا ہے:

''بے شک آسمان اور زمین میں ایمان والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں اور تمام جانوروں میں جو وہ (اللہ) زمین پر پھیلاتا رہتا ہے یقین کرنے والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں اور رات دن کے آنے میں جو رزق (پانی) اللہ نے آسمان سے نازل فرمایا اور اس سے زمین کو اس کے مرجانے کے بعد زندہ کیا اور ہواؤں کے چلانے میں عقلمند لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔ یہ اللہ کی آیتیں ہیں جنہیں ہم تمہارے سامنے ٹھیک ٹھیک پڑھتے ہیں تو اللہ اور اسکی آیتوں کے بعد کونسی بات ہوگی جس پر یہ لوگ ایمان لائیں گے۔'' (سورہ جاثیہ۔ آیات ۳تا۶)

اس دنیا کی ہر وہ حقیقت جس کا ہم ممکنہ طور پر تصور کرسکتے ہیں ایک محدود حقیقت ہوتی ہے جس کی واقعیت کا انحصار چند لازمی اسباب اور حالات پر ہوتا ہے۔ اگر وہ حالات اور اسباب موجود نہ ہوں تو وہ حقیقت دنیا میں موجود نہیں ہوسکتی۔ ہر حقیقت کی ایک حد ہوتی ہے جس کے آگے وہ اپنی ہستی کو نہیں بڑھا سکتی ہے۔ فقط اللہ ہی ایک ایسی ہستی ہے جس کی کوئی حد یا انتہا نہیں۔ اس کی حقیقت کامل ہے اور خواہ ہم کسی طرح بھی اس کا تصور کرنے کی کوشش کریں اس کی ذات لامتناہی ہے۔ اس کی ہستی کسی چیز پر تکیہ نہیں کرتی اور کوئی اسباب یا حالات ایسے نہیں جن کی اسے حاجت ہو۔ ظاہر ہے کہ جو چیز لامحدود ہو اس کے بارے میں ہم کثرت کا خیال بھی نہیں کرسکتے کیونکہ بالفرض اگر ہم کسی دوسری حقیقت کا خیال کریں گے تو وہ پہلی سے مختلف ہوگی۔ جس کے نتیجے میں دونوں محدود ہوجائیں گی۔ مثلاً اگر ہم ایک لامحدود

جسامت کا قیاس کریں تو پھر ہم اس کے ساتھ ساتھ ایک اور لامحدود جسامت کا قیاس نہیں کرسکتے اور اگر ہم ایک دوسری لامحدود جسامت فرض کریں تو وہ پہلی ہی ہوگی۔ پس اللہ ایک ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں۔

ہم پہلے اس بدوی کا ذکر کر چکے ہیں جس نے عین اس وقت جب جنگ جمل زوروں پر تھی حضرت علی علیہ السلام سے سوال کیا کہ کیا آپ وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ اللہ ایک ہے؟ جواب میں حضرت علیؑ نے فرمایا:

"اگر یہ کہا جائے کہ اللہ ایک ہے تو اس کے چار معنی ہیں۔ اس میں سے دو معنی باطل ہیں اور دو درست ہیں۔ جو دو معنی باطل ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ جب انسان یہ کہے کہ اللہ ایک ہے تو وہ تعداد اور گنتی کے بارے میں سوچ رہا ہو۔ یہ معنی باطل ہیں کیونکہ جس کا کوئی دوسرا نہ ہو وہ اعداد کے زمرے میں داخل نہیں ہوسکتا۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ جن لوگوں نے کہا اللہ تین میں سے ایک ہے (یعنی نصرانی) وہ کفر میں مبتلا ہوگئے۔ ایک اور معنی یہ ہیں کہ کوئی کہے کہ فلاں شخص ان لوگوں میں سے ہے یعنی اس جنس کی ایک نوع ہے یا ایک نوع کا ایک فرد ہے۔ جب اس معنی کا اللہ پر اطلاق کیا جائے تو یہ معنی بھی درست نہیں کیونکہ اس سے مراد کسی چیز سے اللہ کی مشابہت کے ہیں اور اللہ ہر مشابہت سے بالاتر ہے۔ جہاں تک ان دو معانی کا تعلق ہے جن کا اطلاق اگر اللہ تعالیٰ پر کیا جائے تو وہ درست ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ کو اس معنی میں ایک مانا جائے کہ اشیاء میں سے کوئی بھی اس سے مشابہ نہیں ہے۔ اللہ ان معنوں میں بے مثل ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اللہ ان معنوں میں ایک ہے کہ کیا ظاہر اطوار پر اور کیا دل میں یا تصور میں اس کی کثرت یا تقسیم کے بارے میں قیاس تک نہیں کیا جاسکتا۔ اللہ اس یکتائی کا مالک ہے۔"[۳]

حضرت علیؑ کا ارشاد گرامی ہے۔" اللہ کی معرفت اس کی توحید کی معرفت ہے۔"[۴] اس سے مراد یہ ہے کہ جب یہ ثابت کردیا جائے کہ اللہ کی ہستی لامحدود ہے تو یہ اس کی توحید کا

کافی ثبوت ہے کیونکہ ایک لامحدود ہستی کے مثل کا قیاس کرنا ناممکن ہے پس اللہ کی توحید کے اور بھی کئی ثبوت ہیں لیکن انہیں پیش کرنے کی حاجت نہیں رہتی۔

ذات الٰہی اور اس کی صفات

اگر ہم ایک انسان کی فطرت کا تجزیہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ اس کی ایک ذات ہے جو اس کی انفرادی انسانیت ہے اور اس کی کچھ صفات بھی ہیں جن کی بدولت اس کی ذات پہچانی جاتی ہے۔ مثلاً کسی ملک میں پیدا ہونے کی صفت یا کسی شخص کا فرزند ہونے کی صفت یا عالم اور فاضل یا طویل القامت اور خوبصورت ہونے کی صفات یا اس کے برعکس صفات، ان میں کچھ صفات مثلاً عالم اور فاضل ہونے کی صفات کے علیحدہ ہونے یا تبدیل ہونے کا امکان ہے تاہم یہ سب صفات اس کی ذات سے مختلف اور ایک دوسرے سے متفاوت بھی ہیں۔

یہ نکتہ (یعنی ذات کا صفات سے مختلف ہونا اور صفات کا ایک دوسرے سے مختلف ہونا) اس بات کا بین ثبوت ہے کہ ایک ذات جو صفات رکھتی ہے اور ایک صفت جو ذات کو متعارف کراتی ہے دونوں محدود ہیں کیونکہ اگر ذات لامحدود ہو تو وہ صفات کو اپنے اندر سمو لے گی اور صفات بھی ایک دوسرے میں شامل ہو کر ایک وحدت بن جائیں گی۔ مثلاً انسان کی ذات اور لیاقت ایک ہی چیز ہوگی اور لیاقت وہی چیز ہوگی جو علمیت ہوگی اور طویل القامتی اور خوبصورتی بھی ایک ہی چیز ہوں گی اور ان سب کے ایک ہی معنی ہوں گے۔

اس مثال سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ذات الٰہی کے بارے میں یہ تصور نہیں کیا جاسکتا کہ وہ بھی انہی معنوں میں صفات کی حامل ہے جن معنوں میں انسان صفات رکھتے ہیں۔ ایک صفت حدیں قائم کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اور ذات الٰہی تمام حدود سے بالاتر ہے (وہ اس نوعیت کی حد سے بھی جو درحقیقت ایک صفت ہے، بالاتر ہے۔)

صفات الٰہی کے معنی

ہم عالم ہستی میں کئی ایسے کمالات سے واقف ہیں جو صفات کی شکل میں ظاہر ہوتے

ہیں ۔ یہ مثبت صفات ہوتی ہیں جن کے ظاہر ہونے پر اس چیز کی جس کی یہ صفات ہیں وجودی قیمت بڑھ جاتی ہے۔ ایک زندہ وجود مثلاً انسان اور بے جان وجود مثلاً پتھر کا مقابلہ کرنے سے یہ نکتہ بخوبی سمجھ میں آسکتا ہے۔ بلاشبہ یہ کمالات اللہ تعالیٰ نے پیدا کیے ہیں اور اپنی مخلوق کو عطا فرمائے ہیں۔ اب اگر یہ کمالات خدا میں مکمل طور پر موجود نہ ہوتے تو وہ دوسروں کو عنایت نہ کرتا اور ان کے ذریعے انہیں کامل نہ بناتا لہٰذا اگر ہم عقل سلیم کے فیصلے کو تسلیم کریں تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ اللہ جو ہر چیز کا خالق ہے علم، قوت اور ہر دوسرے حقیقی کمال رکھتا ہے۔ علاوہ ازایں جیسا کہ پہلے کہا جاچکا ہے کہ اس کے علم اور قوت کی نشانیاں اور نتیجے کے طور پر زندگی کے آثار نظام کائنات میں دیکھنے میں آتے ہیں۔

تاہم اللہ تعالیٰ کی ذات لامحدود ہے اس لیے یہ کمالات جنہیں اس کی صفات کہا جاتا ہے دراصل اس کی ذات ہی ہیں اور سب بعینہٖ ایک چیز ہیں۔ ذات اور صفات میں اور خود صفات کے مابین جو فرق نظر آتا ہے وہ فقط تصور کی سطح پر ہے۔ دراصل حقیقت ایک ہے جو واحد اور ناقابل تقسیم ہے۔[۵]

ذات سے صفات کو منسوب کرکے اسے محدود کرنے یا اس کی کاملیت کے اصول سے انکار کرنے کی فحش غلطی سے بچنے کے لیے اسلام نے اپنے پیروں کو اقرار اور انکار کے درمیان توازن قائم کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس نے انہیں ہدایت کی ہے کہ وہ اس بات پر ایمان رکھیں کہ اللہ علم رکھتا ہے لیکن وہ علم دوسروں کے علم کی مانند نہیں ہے۔ وہ طاقت رکھتا ہے لیکن وہ طاقت دوسروں کی طاقت کے مانند نہیں ہے۔ وہ سنتا ہے لیکن کانوں کے ساتھ نہیں۔ وہ دیکھتا ہے لیکن انسانوں کی طرح آنکھوں سے نہیں، وَعلیٰ ھذا القیاس۔[۶]

صفات کے بارے میں مزید وضاحت :-

توضیح صفات عموماً دو قسم کی ہوتی ہیں: صفات کمال اور صفات نقص ۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے۔ صفات کمال کی نوعیت مثبت ہوتی ہے اور وہ جس کی صفات ہوں، اسے بہتر

وجودی قیمت اور تاثیر عطا کرتی ہیں۔ جب ہم ایک زندہ، دانا اور قادر موجود اور ایک مردہ اور علم وقابلیت سے عاری موجود کے درمیان مقابلہ کرتے ہیں تو یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے۔

صفات نقص ان صفات کے برعکس ہیں۔ جب ہم ان ناقص صفات کا تجزیہ کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ یہ منفی صفات ہیں اور ان میں کمال کا فقدان ہے۔ (مثلاً جہالت، بے صبری، بدصورتی، بیماری، وغیرہ) لہٰذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ صفت نقص کی ضد صفتِ کمال ہے۔ مثلاً علم جہالت کی ضد ہے اور بے بسی قابلیت کی ضد ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے ہر مثبت صفت کو براہ راست اللہ تعالیٰ سے منسوب کیا ہے اور ہر ناقص صفت سے اسے منزہ قرار دیا ہے اور ان ناقص صفات کی نفی کو اس کی صفات گردانا ہے۔ مثلاً ارشاد ہوا ہے کہ ''وہ دانا اور قادر ہے'' یا یہ کہ ''وہ زندہ ہے'' یا یہ کہ ''نہ وہ سوتا ہے نہ اونگھتا ہے'' یا یہ کہ ''تم جان لو کہ تم اللہ کو شکست نہیں دے سکتے۔''

یہ نکتہ کبھی فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ اللہ مطلق حقیقت ہے جس کی کوئی حد یا انتہا نہیں لہٰذا جو مثبت صفت اس سے منسوب کی جائے اس کی بھی کوئی حد نہیں ہوگی۔ وہ نہ مادی ہے، نہ جسم رکھتا ہے اور نہ ہی مکان و زمان تک محدود ہے۔ تمام مثبت صفات رکھتے ہوئے وہ مخلوق جیسی صفات اور حالات سے ماورا ہے۔ ہر وہ صفت جس کا وہ درحقیقت مالک ہے محدودیت کے تصور سے مبرا ہے وہ فرماتا ہے: ''کوئی چیز اس کی مثل نہیں۔'' [۷] (سورہ شوریٰ، آیت ۱۱)

صفات فعل

اس کے علاوہ صفات کو صفات ذات اور صفات فعل میں بھی تقسیم کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات ایک صفت کا انحصار فقط موصوف پر ہوتا ہے مثلاً زندگی، علم اور قوت کی صفات ایک زندہ عالم اور قوی انسان پر منحصر ہوتی ہیں، کسی اور عامل کو درمیان میں لائے بغیر ایک شخص میں ان صفات کی موجودگی کا تصور کرسکتے ہیں۔

بعض اوقات ایک صفت فقط موصوف پر منحصر نہیں ہوتی بلکہ اس کا حامل ہونے کے

لئے بعض خارجی اشیاء کی ضرورت بھی پڑتی ہے۔تحریر گفتگو اور خواہش وغیرہ کے سلسلے میں یہی صورت ہوتی ہے۔ ایک شخص کا تب اس وقت بن سکتا ہے جب اس کے پاس کاغذ ،قلم ، دوات وغیرہ موجود ہو۔ وہ گفتگو اس وقت کرسکتا ہے جب کوئی دوسرا شخص موجود ہو جس کے ساتھ وہ گفتگو کر سکے اور خواہش اس وقت کرسکتا ہے جب وہ چیز موجود ہو جس کی اس کے دل میں خواہش ہو، فقط ایک انسان کی موجودگی یہ صفات پیدا کرنے کے لئے کافی نہیں۔

اس تجزیے سے یہ امر واضح ہوجاتا ہے کہ صفات خداوندی جو درحقیقت اللہ تعالیٰ کی ذات ہی ہیں فقط پہلی قسم کی ہوسکتی ہیں جہاں تک دوسری قسم کی صفات کا تعلق ہے (یعنی وہ صفات جوظہور پذیر ہونے کے لیے بیرونی عوامل کی محتاج ہیں) وہ صفات ذات یعنی خود ذات تصور نہیں کی جاسکتیں کیونکہ جو کچھ اللہ سے ماسوا ہے وہ اس کی مخلوق ہے اور مخلوق ہونے کی بناپر اس کی حیثیت ثانوی ہے۔

جو صفات تخلیق کے عمل کے بعد اللہ تعالیٰ سے منسوب ہوتی ہیں (مثلاً خالق قادر مطلق ، زندگی دینے والا وغیرہ)بعینہٖ اس کی ذات نہیں ہیں بلکہ اس سے مستزاد ہیں۔ وہ صفات فعل ہیں۔صفات فعل سے مراد یہ ہے کہ جب کوئی فعل وقوع پذیر ہوچکتا ہے تو اس صفت کے معانی اس فعل کے حوالے سے یہ سمجھے جاتے ہیں اور ذات سے نہیں (جو یہ فعل کرتی ہے) مثلاً خالق کے معنی تخلیق کے عمل کے بعد سمجھ میں آتے ہیں،تخلیق سے اللہ تعالیٰ کی صفت خلاقی کا پتہ چلتا ہے۔ اس صفت کا انحصار تخلیق پر ہے، اللہ تعالیٰ کی ذات پر نہیں لہٰذا اس صفت کے ظہور سے اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل نہیں ہوتی۔ شنیعیت ، ارادے، اور کلام، کی صفات کو ان کے لغوی معنوں میں صفات فعل تصور کرتی ہے(ارادے کے معنی کسی چیز کی خواہش کرنے اور کلام کے معنی اسلوب بیان کے ذریعے مطلب واضح کرنے کے ہیں۔) بیشتر سنی علماء کے مطابق یہ صفات علم پر دلالت کرتی ہیں اور اسی لیے وہ انہیں صفات ذات تصور کرتے ہیں۔[۸]

قضا وقدر:

قانون علیت تمامتر جہان ہستی پر کسی استثنا کے بغیر حکم فرما اور جاری ہے۔ اس قانون کے مطابق اس دنیا کا ہر مظہر ظہور پذیر ہونے کے لیے ایسے اسباب اور شرائط سے وابستہ ہوتا ہے جو اس کی حقیقت کو ممکن بناتے ہیں۔ اگر وہ تمام اسباب (جنہیں علت تامہ کہا جاتا ہے) موجود ہوں تو اس مظہر (معلول مفروض) کی پیدائش ضروری (جبری) ہوجاتی ہے اور اگر وہ تمام اسباب یا ان میں سے کچھ مفقود ہوں تو اس مظہر کی پیدائش محال ہوتی ہے۔

اس نظریہ کے مطالعہ اور تجزیہ سے مندرجہ ذیل دو مطالب واضح ہوجاتے ہیں:

۱۔ اگر ہم ایک مظہر کا مقابلہ مجموعی علت تامہ اور اس علت تامہ کے اجزاء سے کریں تو علت تامہ سے اس کا تعلق ضروری اور جبری ہوگا لیکن علت تامہ کے اجزاء میں سے ہر ایک جزو کے ساتھ (جسے علت ناقصہ کہا جاتا ہے) نقطاس کا تعلق ممکن ہوگا کیونکہ علت کے اجزاء معلول کے وجود کو ضروری نہیں بلکہ فقط ممکن بناتے ہیں۔

لہٰذا تمام تر جہانِ ہستی پر ضرورت حکم فرما ہے کیونکہ پیدا ہونے کی بناپر اس کے ہر حصے کا علت تامہ کے ساتھ لازمی تعلق ہے۔ اس کا ڈھانچہ کچھ ضروری اور قطعی حوادث کے سلسلے میں ترتیب دیا گیا ہے۔ اس کے باوجود اس کے اجزاء میں (یعنی ان مظاہر میں جو اپنی علت تامہ کے علاوہ کسی علت ناقصہ سے تعلق رکھتے ہیں) امکان کی صفت محفوظ رہتی ہے۔

قرآن مجید نے اپنی تعلیمات میں اس حکم کی ضرورت کو قضائے الٰہی کا نام دیا ہے کیونکہ اس ضرورت کا سرچشمہ وہ ذات ہے جو جہان ہستی کو وجود بخشنے والی ہے اور اس بناپر یہ ایک حتمی حکم اور قضا ہے جس کی خلاف ورزی ممکن نہیں۔ اس کی بنیاد عدل پر ہے اور اس میں کوئی استثناء یا امتیاز نہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''حکومت اور پیدا کرنا فقط اسی کے لئے ہے۔'' (سورہ اعراف۔ آیت ۵۴)

پھر فرماتا ہے:

''جب وہ کسی چیز کا فیصلہ کرلیتا ہے تو اس کے لیے کہہ دیا جاتا ہے کہ ہوجا پس وہ ہوجاتا ہے۔(یعنی وجود میں آجاتی ہے)''(سورہ بقرہ۔آیت ۱۱۷)

مزید فرماتا ہے:

''(جب) اللہ حکم دیتا ہے تو کوئی اس کا حکم ٹال نہیں سکتا۔''

(سورہ رعد۔آیت ۴۱)

۲۔ علت کے اجزاء میں سے ہر جزو معلوم کو مناسب اندازہ اور نمونہ دیتا ہے اور معلول کی پیدائش ان مجموعی اندازوں کے مطابق ہوتی ہے جو علت تامہ میں اس کے لیے معین ہوتی ہے۔مثلاً جو اسباب انسان کے لیے تنفس وجود میں لاتے ہیں وہ مطلق اور غیر مشروط تنفس ایجاد نہیں کرتے بلکہ وہ منہ اور ناک سے متصل ہوا کی ایک معینہ مقدار، معینہ وقت، مقام اور شکل میں سانس کی نالی کے ذریعے پھیپھڑوں میں بھیجتے ہیں۔اسی طرح جو اسباب انسان کی بصارت کو وجود میں لاتے ہیں۔(اور خود انسان بھی ان کا ایک حصہ ہے) وہ بلاقید وشرط بصارت پیدا نہیں کرتے بلکہ اسے ایسی بصارت دیتے ہیں جو مختلف وسائل اور اعضاء کے ذریعے اس کے لئے نپی تلی ہوتی ہے۔یہ حقیقت بلا استثنا دنیا کے تمام مظاہر میں اور ان تمام واقعات میں جو اس میں رونما ہوتے ہیں موجود ہوتی ہے۔

قرآن مجید نے اپنی تعلیمات میں اس حقیقت کو ''قدر'' کا نام دیا ہے اور اسے اللہ تعالیٰ سے منسوب کیا ہے جو تخلیق کا سرچشمہ ہے۔

جیسا کہ فرماتا ہے:

''ہم نے ہر چیز کو اس کی ''قدر'' کے مطابق پیدا کیا ہے۔'' اور ''کوئی چیز ایسی نہیں جس کے ہمارے پاس خزانے نہ ہوں اور ہم ان میں سے ایک نپی تلی مقدار نازل کرتے ہیں۔''(سورہ حجر۔آیت ۲۱)

پس کائنات کا ہر مظہر اور ہر واقعہ جو رونما ہوتا ہے قضائے الٰہی کے مطابق اس کا وجود ضروری ہے اور اس سے مفر نہیں اور اسی طرح ''قدر'' کے مطابق ہر مظہر اور ہر واقعہ جو رونما ہوتا ہے وہ اس حد یا اندازہ سے سرِ مو تجاوز یا انحراف نہیں کر سکتا جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے مقرر کیا ہے۔

انسان اور اختیار

انسان جو فعل انجام دیتا ہے وہ جہانِ ہستی کے مظاہر میں سے ایک مظہر ہے اور دنیا کے دوسرے مظاہر کی طرح اس کا انحصار بھی کلی طور پر اس کے سبب پر ہے اور چونکہ انسان جہانِ ہستی کا ایک جزو ہے اور کائنات کے دوسرے اجزاء کے ساتھ اس کا وجودی تعلق ہے اس لیے ہم یہ نظریہ قبول نہیں کر سکتے کہ دوسرے اجزاء کا اس کے افعال پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ مثلاً جب انسان روٹی کا ایک لقمہ کھاتا ہے تو اسے فقط ہاتھ، پاؤں اور منہ اور علم، قدرت اور ارادے کے وسائل کی ضرورت ہی نہیں ہوتی بلکہ خارجی دنیا میں روٹی کا وجود اور اس کا انسان کی دسترس میں ہونا اور اسکے حصول میں کسی رکاوٹ کا نہ ہونا دوسری زمانی اور مکانی شرائط کا پورا ہونا بھی اس فعل کے انجام دینے کے لئے لازمی ہے۔ اگر ان میں سے ایک سبب بھی موجود نہ ہو تو اس فعل کا انجام پانا ممکن نہیں۔ اس کے برعکس ان سب (یعنی علت تامہ) کی موجودگی میں اس فعل کا انجام پانا لازمی ہو جاتا ہے۔ علت تامہ کے تمام اجزاء کی نسبت سے اس فعل کا ضروری ہونا انسان کی نسبت سے جو علت تامہ کا ایک جزو ہے اس فعل کے امکانی ہونے کے منافی نہیں ہے۔ انسان اسی فعل کو انجام دینے کا امکان یا اختیار رکھتا ہے۔ اگر اس فعل اور علت کے تمام حصوں کے تعلق میں ضرورت موجود ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس فعل اور علت کے کچھ اجزاء (جن میں سے ایک انسان بھی ہے) کا تعلق بھی ضروری اور جبری ہو۔

انسان کا سادہ اور غیر آلودہ ادراک بھی اس نقطۂ نگاہ کی تائید کرتا ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ لوگ اپنی خداداد فطرت کی بدولت ایک طرف تو کھانے پینے اور آنے جانے کا فرق پہچانتے

ہیں اور دوسری طرف صحت اور بیماری، بڑھاپے اور جوانی یا قد و قامت میں تمیز کر سکتے ہیں۔

پہلی قسم کی چیزوں کا تعلق انسان کے ارادے سے ہے اور وہ یہ افعال اپنے اختیار سے انجام دیتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ لوگ اسے کوئی کام کرنے یا نہ کرنے کو کہتے ہیں اور اسی بنا پر کبھی اس کی مدح یا مذمت کرتے ہیں لیکن جہاں تک دوسری قسم کی چیزوں کا تعلق ہے انسان کی ان کے بارے میں کوئی ذمہ داری نہیں اور نہ ہی ان کے متعلق کوئی خدائی احکام ہیں کیونکہ ان چیزوں پر اس کا کوئی اختیار نہیں۔

صدر اسلام میں انسانی اعمال کے دینی پہلو کے بارے میں دو مکاتب فکر تھے۔ ایک گروہ کہتا تھا کہ انسانی اعمال اللہ تعالیٰ کے تخلف ناپذیر ارادے کا نتیجہ ہیں۔ یہ لوگ انسان کو اپنے افعال میں مجبور سمجھتے تھے اور اس کے خیال کے مطابق ان کے اختیار اور ارادے کی کوئی قیمت نہیں تھی۔ دوسرا گروہ انسان کو اس کے افعال میں آزاد سمجھتا تھا۔ ان کے مطابق اللہ کے ارادے کا انسانی افعال سے کوئی تعلق نہیں تھا اور وہ افعال 'قدر' کے حکم سے خارج تھے۔

لیکن اہلبیت رسولؐ کی تعلیمات کے مطابق، جو قرآن مجید کی ظاہری تعلیمات سے مطابقت رکھتی ہیں، انسان اپنے افعال میں مختار ہے لیکن مستقل (آزاد) نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے اختیار کے ذریعے اس پہلو کو چاہا ہے اور جیسا کہ ہم پہلے واضح کر چکے ہیں اللہ تعالیٰ نے علت تامہ کے تمام اجزاء کے ذریعے جن میں سے ایک انسان کا اختیار اور ارادہ بھی ہے اس فعل کو چاہا ہے اور اسے ضروری بنایا ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس چاہنے کے نتیجے میں وہ فعل ضروری ہے اور انسان بھی اس میں مختار ہے یعنی وہ فعل علت کے تمام اجزاء کی نسبت سے ضروری ہے اور ان میں سے ایک جزو یعنی انسان کی نسبت سے اختیاری اور ممکن ہے۔۹

حوالے:

ا۔ کتاب خدا میں اس دلیل کی جانب اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے: "کیا اللہ کے بارے میں کوئی شک ہو سکتا ہے جو کہ آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔" (سورہ ابراہیم۔

آیت ۔۱)

۲۔یہاں بھی اسی آیۂ مبارکہ کی طرف اشارہ ہے جو اوپر نقل کی گئی ہے۔ (یعنی ''ہم انہیں اپنی نشانیاں دکھائیں گے...'' مظاہر قدرت اور جو حقائق انسان کی روح میں ہیں اللہ کی نشانیاں ہیں۔

۳۔بحار الانوار جلد ۲ صفحہ ۶۵

۴۔ بحار الانوار۔ جلد ۲۔ صفحہ ۱۸۶

۵۔امام صادقؑ نے فرمایا: '' اللہ کی ہستی ناقابل تغیر ہے۔ جب جاننے کو کچھ نہ تھا اس کا علم اس کی اپنی ذات تھی، جب سننے کو کچھ نہ تھا، اس کی سماعت اس کی ذات تھی۔ جب دیکھنے کو کچھ نہ تھا تو اس کی بینائی اس کی ذات تھی اور جب کوئی چیز ایسی نہ تھی جس پر قدرت استعمال کی جائے تو قدرت اس کی اپنی ذات تھی۔'' (بحار الانوار۔ جلد ۲۔ صفحہ ۱۲۵)

اس مسئلے کے بارے میں اہلبیت رسولؐ کی بے شمار احادیث ہیں، ملاحظہ کریں نہج البلاغہ ، توحید صدوق (مطبوعہ تہران ۱۳۷۵ھ) عیون الاخبار، ابن قتیبہ (مطبوعہ قاہرہ ۳۵۔۱۹۲۵ء) اور بحار الانوار۔ جلد ۲۔

۶۔امام باقرؑ اور امام صادقؑ نے فرمایا '' اللہ ایک ایسا نور ہے جو تاریکی سے آمیختہ نہیں ہے۔ وہ ایک ایسا علم ہے جس میں جہالت نفوذ نہیں کرسکتی اور ایسی زندگی ہے جس کے لئے موت نہیں ہے۔'' (بحار الانوار۔ جلد ۲ صفحہ ۱۲۹)

امام علی رضاؑ نے فرمایا ہے: '' صفات الٰہی کے بارے میں لوگوں نے تین راستے اپنائے ہیں۔ پہلا گروہ وہ ہے جو سمجھتا ہے کہ اللہ بھی وہی صفات رکھتا ہے جو دوسروں کی ہیں۔ دوسرا گروہ صفات کی نفی کرتا ہے۔ صحیح راستہ تیسرے گروہ کا ہے جو صفات الٰہی کا قائل ہے لیکن انہیں مخلوق کی صفات کے مشابہ نہیں سمجھتا۔'' (بحار الانوار۔ جلد ۲ صفحہ ۹۴)

۷۔ امام صادقؑ نے فرمایا: '' اللہ کی تعریف زمان ، مکان ، حرکت ،تعبیر اور سکون کے ذریعے نہیں کی جاسکتی بلکہ وہ زمان ، مکان حرکت ،تعبیر اور سکون کا خالق ہے۔'' (بحار الانوار جلد ۲

صفحہ ۹۶)

۸۔ امام صادقؑ نے فرمایا۔" اللہ اپنی ماہیت میں ہمیشہ سے دانا تھا جب کہ جاننے کو کچھ نہیں تھا اور صاحب قدرت تھا جبکہ ایسی کوئی چیز نہیں تھی جس پر وہ اپنی قدرت مسلط کرتا۔"

حدیث کا راوی کہتا ہے:" میں نے کہا: اور وہ گویائی بھی رکھتا تھا؟ انہوں نے جواب دیا: کلام مخلوق ہے۔ اللہ تھا اور گویائی نہیں رکھتا تھا۔ پھر اس نے کلام پیدا کیا۔" (بحار الانوار۔ جلد ۲ صفحہ ۱۴۷) اور امام علی رضاؑ نے فرمایا ہے:" ارادہ لوگوں کے باطنی وجود سے جنم لیتا ہے اور اس کے بعد فعل ظاہر ہوتا ہے۔ جہاں تک اللہ کا تعلق ہے اس کا فعل پیدا کرنا ہے کیونکہ ہمارے برعکس اللہ نیت، مقصد اور نامربوط خیالات نہیں رکھتا۔" (بحار الانوار جلد ۲ صفحہ ۱۴۴)

۹۔ بحار الانوار۔ جلد ۳ صفحہ ۵

☆☆☆☆

آیت اللہ شہید بہشتی و شہید باہنر

توحید شناسی اور جہاں شناسی توحیدی

خدائے مہربان:

اللہ تبارک وتعالٰی اپنی تمام مخلوقات پر بے حد مہربان اور رحم وکرم کرنے والا ہے۔ اس نے سب کو بے شمار نعمتیں عنایت کی ہیں اور اچھی زندگی گزارنے کے لئے مختلف النوع وسائل وامکانات ہمارے اختیار میں دیے ہیں۔ وہ معاف کرنے والا اور سب کی توبہ قبول کرنے والا ہے۔ اگر انسان گناہ اور فسق وفجور کی زندگی چھوڑ کر پاکیزگی اور بھلائی کی جانب پلٹے تو وہ اس شخص پر واپسی کا راستہ بند نہیں کرتا بلکہ اس کی توبہ اور رجعت کو قبول فرماتا ہے مگر اس کے لیے شرط اتنی ہے کہ وہ شخص صدق دل سے خطا اور گناہ کا راستہ چھوڑ کر پاکیزگی اور نیکی کی جانب ہمہ تن متوجہ ہوگیا ہو۔

خدائے قہار:

اس کارخانہ ہستی میں خدائے بزرگ کی مہربانی اور رحمت کی لامحدود وبے حساب نشانیاں جگہ جگہ پھیلی ہوئی ہیں اور دوسری مخلوقات کی ہی طرح انسان بھی اس لامحدود رحمت سے بہرہ ور ہی نہیں بلکہ اس بارے میں ایک امتیازی حیثیت حامل ہے اور وہ امتیازی حیثیت ایک مخصوص نعمت کی وجہ سے ہے جو اسے عطا ہوئی ہے اور یہ نعمت اس کا صاحب اختیار ہونا

ہے، وہ اپنے اختیار اور علم کے ذریعے بھلائی اور برائی میں تمیز کرتا ہے اور پھر ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کرتا ہے۔ اس انتخاب سے منسلک سمجھ بوجھ پر مبنی اختیار کی صورت یہ ہے کہ انسان کے افعال کا کم از کم ایک حصہ پسندیدہ اور ناپسندیدہ ہونے کی صلاحیت رکھتا ہو اور پسندیدہ کام کرنے کی صلاحیت اس کے لیے شادمانی، انعام اور ثواب کا موجب ہو اور ناپسندیدہ کام کرنے کی صلاحیت اس کے لیے دردناک اور تکلیف دہ ہو اور عذاب الیم اور سزا کا موجب بنے۔

پسندیدہ اور لائق ثواب اوصاف سے عارض ہونے اور ناپسندیدہ اور قابل عذاب اوصاف سے دوچار ہونے کے سلسلے میں جو پریشانی اور فکر انسان کو لاحق ہوتی ہے وہ اسے اس بات پر آمادہ کرتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو ایک ایسا انسان بنائے جو ثواب کے لائق ہو اور عذاب سے بچ جائے۔ انسان میں اس خوف اور پریشانی کی ایجاد بجائے خود خدائے تعالیٰ کی رحمت ہے۔ ایک ایسی رحمت جس کے ساتھ ناشکرگزار لوگوں کے لئے خداوند عالم کی جانب سے سزا وار اس کا غضب پیوستہ ہے۔

اسی بنا پر قرآن مجید اس سلسلے میں بار بار خدائے تعالیٰ کے غضب کا ذکر کرتا ہے (اس غضب کا جو سرکشوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے) اور سرکش لوگوں کے لئے عذاب الیم اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے سخت سزا کی خبر دیتا ہے۔

انصاف کرنے والا خدا:

خدائے تعالیٰ کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ ہمیشہ ہم سے یہی چاہتا ہے کہ ہمارے بھی کاموں کی بنیاد عدل و انصاف پر ہو۔ اس دنیا میں اس نے ہر چیز کو ہستی کے محکم نظام کی ضروریات کے مطابق تخلیق فرمایا ہے اور اس دنیا کی ہر چیز ایک دوسرے سے ہم آہنگ اور ایک دوسرے کو مکمل کرنے والی ہے۔ جہاں تک دوسری دنیا کا تعلق ہے اس نے نیکوکار کے لئے انعام اور گناہ گار کے لئے سزا کو عمل اور رد عمل کے مضبوط نظام کے چوکھٹے میں قرار دیا ہے۔ اس دنیا

میں ہر شخص وہی کاٹے گا جو اس نے اس دنیا میں بویا ہوگا اور اپنے آپ کو اس انسانی شخصیت کا حامل پائے گا جو اس نے دنیا میں اپنے لیے تعمیری کی ہوگی۔ جو کڑواہٹ اور مٹھاس اسے دوسری دنیا میں ملے گی وہ اس کے اس دنیا میں کئے ہوئے کاموں کا پھل ہوگا جو اسے پورا کا پورا بے کم وکاست مل جائے گا اور اس بارے میں اس پر کوئی ظلم نہ ہوگا۔ ہر انسان کا ابدی مستقبل خود اس کی کوشش پر منحصر ہے۔ اس کوشش پر جو وہ اپنی تعمیر کے سلسلے میں کرتا ہے خواہ وہ تعمیر سیدھی ہو یا کج ہو۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ اس کوشش پر جو انسان ماحول کی تخلیق کے لئے کرتا ہے تا کہ اپنی اور دوسروں کی اچھی زندگی کے لئے فطری اور اجتماعی حالات پیدا کر کے اپنی تعمیر کے لئے بہتر طور پر راہ ہموار کر سکے۔

یہ ہے ایک مختصر خاکہ قرآن مجید کی خدا شناسی کا اور اس سوجھ بوجھ کا جو اس کتاب الٰہی نے خدائے خالق کے بارے میں ہمیں عطا کی ہے۔ یہ ایسی سوجھ بوجھ ہے جس کی تصدیق وحی الٰہی سے ہوئی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ ان معلومات پر بھی تکیہ کرتی ہے جو انسان خدائے تعالیٰ کے بارے میں نشانیوں اور اس کے ناموں اور صفات میں تدبر کر کے حاصل کر سکتا ہے۔ ایک ایسی سوجھ بوجھ جو معرفت کے پیاسے کو حتی الامکان وکم وبیش سیراب کر دیتی ہے اور میدان عمل میں بھی کام آتی ہے اور ہمیں اپنے اس سب سے بڑے مسئلے کے حل میں بھی مدد دیتی ہے جس سے ہم دوچار ہیں اور وہ یہ کہ ''زندگی کو کیا رخ دیا جائے۔'' اس خدا شناسی سے حسن فہم حاصل کر کے جب ہم بڑھتے ہیں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ جس شخص کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہو اس کی زندگی سراسر جوش اور خوشی، امید اور کوشش اور توانائی اور کارگزاری سے عبارت ہوتی ہے اور دوسرے انسانوں سے اسکے تعلقات ہمیشہ اس کی اپنی فکری اور عملی آزادی کو مدنظر رکھتے ہوئے دوسروں سے اشتراک کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی فکری اور عملی آزادی کا احترام کرنے پر استوار ہوتے ہیں۔ جس شخص کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہو وہ کسی کی غلامی اختیار نہیں کرتا اور نہ ہی وہ دوسروں کو اپنا غلام بنانے کا کوئی منصوبہ بناتا ہے۔

وہ ایک ایسا آزاد شخص ہوتا ہے جو دوسروں کی آزادی بھی چاہتا ہے اور ایسا پاک انسان ہوتا ہے جو دوسروں کو بھی پاک وپاکیزہ دیکھنے کا خواہاں ہوتا ہے حتیٰ کہ وہ اپنی ہوس یا غصے کا تابع بھی نہیں ہوتا۔ وہ سچائی کا غلام ہوتا ہے جہاں سچائی دیکھتا ہے اسی جانب بڑھتا ہے اور جہاں کوئی چیز ناحق دیکھتا ہے ادھر سے منہ موڑ لیتا ہے۔ وہ ہمیشہ سچائی کا حامی اور جھوٹ سے برسرِ پیکار رہتا ہے۔

الٰہی آفاقیت کا کردار:

مادی بصیرت، دنیا اور انسان کو فقط مادی، فطری اور محسوس پہلوؤں سے دیکھتی ہے۔ وہ اس دنیا سے ماوراء، کسی خالق یا منتظم کی موجودگی کا اعتراف نہیں کرتی اور معاشرے کی ضروریات اور انسانی وجود کے حجم کو فطری ضروریات کے احاطے میں محصور کردیتی ہے۔ اسکے علاوہ وہ انسانی زندگی کو اسی دنیا کے چوکھٹے میں محدود سمجھتی ہے۔ وہ یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں کہ اس دنیا کا انتظام کوئی باشعور ہستی چلا رہی ہے یا اس مادی زندگی کے علاوہ انسان کی کوئی اور ضروریات اور دلچسپیاں بھی ہیں۔ یا یہ کہ موجودہ دنیا کے بعد کسی دوسری دنیا کا وجود بھی ہے۔ لہٰذا اگر وہ انسانی زندگی کے لیے کسی پروگرام یا مقصد کی نشاندہی کرتی ہے تو وہ بھی اسی مادی دنیا تک محدود ہوتا ہے۔

اس کے برعکس جہاں تک الٰہی جہاں بینی اور آفاقیت کا تعلق ہے وہ ایک حکیم، قوی، صاحب تدبیر، دیکھنے اور سننے والے اور مہربان پروردگار کو فطری روابط اور عوامل کا حاکم سمجھتی ہے اور دنیا کو اس کی قلمرو خیال کرتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ تمام فطری قوانین کا اعتراف بھی کرتی ہے اور دنیا کے نظم وضبط کو قبول کرتی ہے۔ تاہم وہ اللہ تعالیٰ کے ارادے کو ان تمام قوانین اور عوامل پر حاوی سمجھتی ہے اور تمام علمی قوانین اور روایات کو تخلیق کا طریق کار اور خدا کی مخلوق سمجھتی ہے۔ اسی خدا کی مخلوق جو فیض، رحمت، حکمت، مہربانی اور عدالت کا سرچشمہ ہے۔

یوں تو ایک خدا شناس انسان اپنے آپ کو ایک تاریک اور بے مقصد دنیا میں نہیں

بلکہ ایک آگاہ، ہدایت یافتہ اور عدل پر مبنی دنیا میں پاتا ہے اور ایسے ایما کے ساتھ خدا کو اپنے ساتھ دیکھتا ہے۔ اس خدا کے ساتھ جو ایک ایسا مضبوط سہارا، قوت اور حرکت کا سرچشمہ اور روح پرور مددگار ہے جو انسان ترقی کی راہیں کھول دیتا ہے۔

الٰہی جہاں بینی وآفاقیت کے لیے انسان کی طبیعی حاجتوں اور انہیں پورا کرنے کی ضرورت کا اعتراف کرتے ہوئے اس کی روحانی ضروریات کا خیال بھی رکھتی ہے۔

انسان کی روحانی ضروریات میں روح کی بلند پروازی، دل کی صفائی، سچائی سے لگاؤ، کمال کی خواہش، پاکیزگی سے تعلق، محبت، آزاد منشی، قربانی کا جذبہ اور بالآخر انسانیت شامل ہیں۔ یہی وہ چیزیں ہیں جن کا موجودہ دور میں بڑی شدت سے خلا محسوس کیا جارہا ہے۔ صنعتی معاشرے اپنے آپ کو ان صفات سے عاری پاتے ہیں اور ان کے فقدان سے جو خلا پیدا ہوا ہے اسے بے حد محسوس کرتے ہیں اور اکثر اپنی پیاس سطحی طور پر بجھاتے ہیں اور مغرب کے نئے عرفان کے سانچے میں زندگی سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

یہ فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ الٰہی آفاقیت فقط معنویت، عرفان اور اخلاقی ضروریات ہی نہیں بلکہ یہ انسان کی طرف ہمہ جہتی توجہ کا نام ہے جس میں اس کی مادی اور معنوی ضروریات شامل ہیں۔ مختصراً یہ کہ الٰہی جہاں بینی سے مراد انسان کو اس کے ہمہ جہتی کمال کے حصول کی راہ پر چلانا ہے۔

وسیع اور دوم مرحلہ زندگی:

الٰہی جہاں بینی کی بدولت پتہ چلتا ہے کہ انسان کی زندگی وسیع اور پائیدار ہے اور اس دنیا میں گزارے ہوئے فقط چند برسوں تک ہی محدود نہیں چنانچہ انسان کو قطعی طور پر بتایا گیا ہے کہ تو ایک ہمیشہ رہنے والی چیز ہے اور موت کی وجہ سے تیرے فنا ہوجانے کا کوئی سوال نہیں بلکہ تو اپنی زندگی ایک دوسری دنیا میں دوبارہ شروع کریگا۔ اس دنیا میں ہر چیز بیشتر شدت، خلوص اور وسعت کے ساتھ جلوہ گر ہوگی اور جہاں وسیع اور جاودانی لذتیں اور کامیابیاں اپنے

اوج کمال پر ہوں گی اور دوسری طرف اس زندگی میں مصائب آلام اور محرومیاں بھی شدید ہوں گی۔

الٰہی آفاقیت اسے یہ بھی بتاتی ہے کہ اے انسان !تو جو شروع سے ہی ہر چیز سے زیادہ اپنے فائدے کے متعلق سوچتا تھا اور یہ چاہتا تھا کہ تکلیفوں اور محرومیوں سے نجات حاصل کرے اور لذت ،خوشی اور کامیابی سے ہمکنار ہو۔ تجھے معلوم ہونا چاہئے کہ آئندہ آنے والی زندگی میں لذت اور تکلیف ،خوش نصیبی اور کامیابی اور ناکامی زیادہ خالص اور زیادہ وسیع شکل میں ظہور پذیر ہوں گی اور اس آئندہ زندگی کا تمام تر دارومدار تیری موجودہ زندگی پر ہوگا اور اس دنیا میں تو جو کچھ کرتا ہے وہاں اسی کا ردعمل ہوگا۔

جو ذی شعور انسان اپنے کام کے حاصل کے بارے میں سوچتا ہے اور جس کی ہر کوشش نپی تلی اور کسی مقصد کے حصول کے خاطر ہوتی ہے اسے اپنی کوشش کے نتائج سے بخوبی آگاہ ہونا چاہئے اور اگر اسے پتہ چل جائے کہ ایک کام نہ فقط یہ کہ اسے محرومی سے نجات نہیں دلاتا بلکہ اسے محروم کردیتا ہے یا نہ فقط یہ کہ ایک عمل اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچاتا بلکہ اسے نقصان سے دوچار کردیتا ہے تو اس کے لئے لازم ہے کہ اپنے طریق کار پر نظر ثانی کرے۔

نتیجہ:

اس طرح الٰہی آفاقیت و جہاں بینی میں انسان اپنی ذات کے خول میں ہی بند نہیں رہتا بلکہ اس کا ہدف خدا اور خدا کی مخلوق ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ فقط اپنی مادی ضروریات ہی کے بارے میں نہیں سوچتا بلکہ مادی دلکشیوں اور روحانی ضروریات دونوں کے متعلق غور کرتا ہے۔ وہ فقط موجود زندگی کی ضروریات اور اس زندگی میں کی گئی کوششوں کے مثبت اور منفی اثرات پر ہی غور نہیں کرتا بلکہ اس دنیا کی خوش نصیبی اور آخرت کی سعادت کی تلاش میں رہتا ہے۔اور دونوں دنیاؤں کی پریشانی اور تکلیف سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔

یقیناً دینی جہاں بینی و آفاقیت اسی لائحہ عمل کے ساتھ انسان کو آگے بڑھاتی ہے۔

دین پر ایمان کے روحانی اور عملی اثرات:

دین پر ایمان رکھنے کے نتیجے میں انسان اپنے اندر ایک طاقت سی محسوس کرتا ہے۔ وہ زیادہ خلوص اور پاکیزگی کے ساتھ خدمت کے کام میں لگ جاتا ہے اور اپنے مقصد کے حصول کی خاطر برے وسائل جیسے بھیک، رذالت، اور خوشامد وغیرہ کا سہارا نہیں لیتا۔ اگر اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے اسے تکلیف اٹھانی پڑے یا کسی فائدے سے ہاتھ دھونا پڑے تو اس کے پائے استقلال میں لغزش نہیں آتی۔

وہ انسان اور انسانیت سے دل وجان سے محبت کرتا ہے اور ان کی بھلائی کے بارے میں سوچتا ہے اور جن لوگوں کا طرز فکر اسی جیسا ہو ان کے ساتھ ایک قلبی تعلق محسوس کرتا ہے۔ جب وہ معاشرے کی بہتری کے لیے کوشش کرتا ہے اور دوسروں کی خدمت کرتا ہے تو اسے خوشی حاصل ہوتی ہے۔

وہ اپنے آپ کو اپنے مقصد میں غرق پاتا ہے اور خودغرض، قریبی اور لالچی لوگوں کا ساتھ نہیں دے سکتا اور نہ ہی کوئی ایسی کوشش کرتا ہے جس سے ان لوگوں کو فائدہ پہنچانا مقصود ہو۔ نتیجے کے طور پر اس کے اندر زیادہ صراحت، قاطعیت اور رواداری کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔

بلاشبہ جو شخص صدق دل سے خدا کی پرستش کرتا ہو اس کے دل میں بنی نوع کی بہتری اور نجات کا زیادہ سے زیادہ خیال رہتا ہے اور وہ اس راستے میں زیادہ ایثار سے کام لیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسے دوسری دنیا میں اپنے معمولی سے معمولی کام کی بھی بہت زیادہ جزا کی توقع ہوتی ہے۔ اور وہ اس دنیا میں بھی اپنی تمام کوششوں کو ردعمل کے قانون کے تابع سمجھتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر اپنے مقصد کے حصول کے لیے اسے اپنی جان بھی قربان کرنی پڑے تو وہ اپنے آپ کو گھاٹے میں نہیں سمجھتا کیونکہ موت کے نتیجے میں وہ ہر چیز حاصل کر لیتا ہے اور زندہ کامیاب اور خوش نصیب ہوتا ہے۔ اگر وہ معاشرے کی بہتری کی خاطر رقم خرچ کرتا ہے تو اسے کوئی نقصان نہیں ہوتا بلکہ وہ بہت سی چیزیں حاصل کر لیتا ہے کیونکہ ایک تو وہ

اپنے ایمان اور مرضی کے مطابق قدم اٹھاتا ہے اور اس کی جزا بھی اسے ملے گی اور دوسری بات یہ ہے کہ معاشرے کی جو خدمت وہ بجالاتا ہے اس سے معاشرے کی بھلائی ہوتی ہے اور معاشرے کے ایک فرد کی حیثیت سے اسے خود بھی فائدہ ہوتا ہے۔

اور بالآخر اگر وہ مثبت اور اصولی طور پر اپنی قوت، دماغ، تدبیر، کوشش، علم، یا دولت خدا کی راہ میں اور خلق خدا کی بہتری کے لیے صرف کرتا ہے تو یہ اس کے ایمان کی راہ میں اور خود اس کے لئے دونوں جہاں میں ایک تعمیری، امید افزا اور فائدہ مند چیز ہے۔

اگر ہم ایسے انسان کو کسی خودغرض اور مادہ پرست انسان کے بالمقابل کھڑا کریں تو اس مقابلے کا کیا نتیجہ برآمد ہوگا؟

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسانی معاشرے کی ہمہ گیر ترقی کے لئے کس قسم کے افراد کی ضرورت ہے؟ کیا ایسے لوگوں کی جو خود بین ہوں یا ایسے لوگوں کی جو خدا کی معرفت رکھتے ہوں؟ کیا ایسے اشخاص کی جنہیں اپنے فائدے ہی کی فکر ہو یا ایسے افراد کی جنہیں خدا کی تلاش بھی ہو؟

اسلام کا تصور انسان:

اسلامی آفاقیت وجہاں بینی کے مختلف حصے ہیں۔ ان میں سب سے پرکشش حصہ وہ ہے جس کا تعلق انسان سے ہے۔ قرآن مجید اس اشرف مخلوق کے بارے میں اپنا ایک مخصوص نظریہ رکھتا ہے۔ اس مقدس کتاب کے نقطہ نگاہ سے انسان محض ایک ایسا فطری مخلوق وموجود نہیں ہے جسے دوسرے فطری موجودات کی طرح ایک معین سانچے میں ڈھال کر ایک مخصوص مدار میں ڈال دیا گیا ہو اور وہ یہ قدرت نہ رکھتا ہو کہ وہ اس مدار سے سرمو انحراف کر سکے۔

صاحب اختیار وانتخاب:

قرآن مجید کے مطابق انسان ایک ایسا مخلوق وموجود ہے جسے خود سازی یعنی اپنی تعمیر خود کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ ایک ایسا موجود جو "نقش الٰہی، یعنی خلیفہ الٰہی

ہونے اور خدائی قدرت کے حامل ہونے کا رتبہ رکھتا ہے۔لہٰذا وہ ایک ایسا موجود ہے جو نصف مادے پر اور نصف الوہیت پر مشتمل ہے یا خود قرآن مجید کی وضاحت کے مطابق ایک ایسا خاکی موجود ہے جس میں روح الٰہی پھونکی گئی ہے۔ خیر وشر کی سمتوں میں چلنے والی کوناکوں صلاحیتیں اس کے وجود میں ملا دی گئی ہیں اور خود اسے یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اپنے ارادے اور اختیار کے ساتھ اپنے راستے کا انتخاب کرلے۔

"ہم نے انسان کو مختلف اور پراگندہ عناصر سے مرکب قطرے سے پیدا کیا تاکہ اسے آزمائیں۔ ہم نے اسے سننے والا اور دیکھنے والا بنایا اور اس کو راستہ بھی دکھادیا اب وہ خواہ شکرگزار ہو یا ناشکرگزار۔" (سورہ دھر آیات ۲۔۳)

انسان کی علمی استعداد:

جن موجودات کے حالات سے ہم واقفیت رکھتے ہیں ان میں سے انسان سب سے زیادہ علمی استعداد رکھتا ہے یہاں تک کہ علم حاصل کرنے کی معاملے میں وہ فرشتوں پر بھی سبقت لے گیا ہے۔ پہلے انسان نے اپنی پیدائش کے آغاز میں ہی وہ چیزیں سیکھ لی تھیں جن سے فرشتے نابلد تھے۔" خدا نے آدم کو سب (چیزوں کے نام) نام سکھادیئے۔ پھر انہیں فرشتوں کے سامنے لایا اور کہا: اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو (کہ تم انسان سے برتر ہو) تو مجھے ان چیزوں کے نام بتاؤ۔فرشتوں نے کہا: تو ہر عیب سے پاک وپاکیزہ ہے ہم تو جو کچھ تو نے بتایا ہے اس کے سوا کچھ نہیں جانتے ہیں۔ تو بڑا جاننے والا مصلحتوں کا پہچاننے والا ہے (اس وقت خدا نے آدم کو) حکم دیا کہ اے آدم تم انہیں ان سب موجودات کے نام بتادو۔" (سورہ البقرہ۔ آیات ۳۱۔۳۲)

انسان کا بلند مقام:

ایک بہت وسیع دائرے میں علم کے حصول پر قدرت حاصل ہونا اور ساتھ ہی ساتھ بے شمار عملی اور اجرائی قوتیں میسر ہونا اور اپنے راستے اور مرضی کی سمت کے انتخاب پر قادر ہونا

ایک بہت بڑا امتیاز ہے جو خدا نے انسان کو بخشا ہے اور اس طرح اسے اپنی بہت سی پیدا کی ہوئی چیزوں پر برتری عطا کی ہے۔

"ہم نے انسانوں کو بلند مقام عطا کیا۔ خشکی اور سمندر میں سواری کے وسیلے ان کے اختیار میں دیئے۔ اچھی اور پاکیزہ چیزیں ان کی دسترس میں دیں اور انہیں اپنی پیدا کی ہوئی بہت سی چیزوں پر برتری بخشی۔" (سورہ بنی اسرائیل: آیت ۷۰)

حاملِ امانت:

جو خاص قوتیں انسان کو عطا کی گئی ہیں ان کا ذکر سورہ احزاب کی ۷۲ ویں آیت میں ایک ایسی امانت کے عنوان سے کیا گیا ہے جو بہت قیمتی اور عظیم ذمہ داری کی حامل ہے اور جو فقط انسان کے لائق ہے۔ صرف انسان ہی ہے جس نے اس امانت کا بوجھ اٹھایا ورنہ آسمانوں، زمین اور پہاڑوں نے اپنی تمام تر عظمت کے باوجود اپنے آپ میں اس امانت کے بوجھ کو اٹھانے کی قوت نہیں پائی اور اسے قبول کرنے سے معذوری ظاہر کی۔

"ہم نے اپنی امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کو پیش کی تو انہوں نے اس کا بار اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے لیکن انسان نے اسے اٹھالیا۔"

انسانی تشخص:

آدمی کی انسانی شخصیت کا دارومدار اس پر ہے کہ وہ خدا کی اس عظیم اور بیش قیمت امانت یعنی اپنی پسند کے راستے کے امکان کی حفاظت کرے۔ اسکی سعادت اس میں ہے کہ وہ اس نیک امکان سے استفادہ کرے۔ انسانی معاشرہ بھی فقط اسی وقت تک انسانی معاشرہ ہے جب تک ہر انسان کو اپنی زندگی کے لیے بہترین راستے کا انتخاب کرنے کی آزادی ہو۔ وہ خود سوچے۔ خود جانچے اور خود انتخاب کرے۔ نہ یہ کہ اس کی صورت ایک ایسے جسامت رکھنے والے موجود کی ہو جو اس طرح سوچے جیسے دوسرے چاہیں اور اس راہ پر چلے اور وہ کام کرے اور اس طرح زندگی بسر کرے جسے دوسرے اس کے لیے تجویز کریں۔ اگر ایسا ہو تو پھر وہ انسان

ایک ''شخص'' نہیں بلکہ ''شئی'' ہے یعنی ایک ایسا موجود ہے جس کا نہ کوئی اپنا ارادہ ہے اور نہ مستقل شخصیت وہ ایک ایسا انسان نہیں جو صاحب ارادہ ہو اور جس نے ایسے کام کا انتخاب کیا ہو جسے وہ اپنے لیے درست سمجھتا ہو بلکہ وہ دوسروں کے کام اور دوسروں کے ارادے کا پیرو ہے۔

وہ سب سے بڑی اور جانکاہ کمی اور وہ سب سے زیادہ دردناک تحقیر جس کا تختۂ مشق انسان دور حاضر کی زرق برق مشینی زندگی میں بنا ہوا ہے یہ ہے کہ وہ اعلانیہ انسانیت سے خارج ہوگیا ہے اور کوکوں عجیب وغریب اور دیو پیکر مشینوں کا بے مایہ ضمیمہ بن کر رہ گیا ہے وہ ایک ایسا ضمیمہ ہے جس کا رتبہ بیشتر صورتوں میں یہاں تک کہ اس کے کام کی اجرت اور اقتصادی قدر وقیمت کے لحاظ سے بھی اس مشین سے کم ہے جو اس کے پہلو میں نصب کی گئی ہے۔ انسان کی شخصیت مسخ کرنے کے لیے مادی اور جبری فلسفوں نے دوسرے عوامل سے کہیں بڑھ کر ارادہ کیا ہے لیکن اس خداداد امانت نے جو انسان کی روح کی گہرائیوں میں ودیعت کی گئی ہے بالآخر اپنا کام کیا ہے اور ہمارے زمانے کے انسان کو ہوش دلا دیا ہے اور وہ پھر ایک مرتبہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہوگیا ہے تاکہ مشینوں کی غلامی کا جوا اپنی گردن سے اتار پھینکے اور اسی نیم خواب بیداری کی حالت میں وہ ایک ایسے مکتب کی تلاش میں اٹھ کھڑا ہوا ہے جو اسے اتنا خوار وحقیر نہ سمجھے اور اس کی انسانیت اور بزرگی اسے لوٹا دے اور اسے ایسا فکری اور اجتماعی نظام پیش کرے جو فی الواقع اس کے بہتر انسان بننے میں معاون ومددگار ثابت ہو۔

انسان کو ''خود پرستی'' کے بندھن سے رہائی دلانا:

اسلامی نقطۂ نگاہ سے انسان کے اس تنگ کوچہ سے رہائی پانے کا واحد راستہ یہ ہے کہ وہ ''خود پرستی'' کے بندھن سے آزاد ہوکر خدا پرست بن جائے۔ جو انسان فقط اپنی مادی خواہشات کے بارے میں سوچے اور اس کے تمام تر جوش وخروش کا منتہائے مقصود یہ ہو کہ اچھا کھائے اور اچھا پیئے اچھا پہنے، اپنی جنسی خواہشات کو بہتر طور پر پورا کرے اور اچھی سے اچھی اور زیادہ سے زیادہ تفریحات میں سرگرم رہے یا دن رات رتبے اور شہرت کے حصول کی

کوششوں میں مگن رہے وہ آزاد انسان ہرگز نہیں بن سکتا۔ کیونکہ وہ باقی سب چیزوں سے زیادہ اپنی انہی ہوسنا کیوں کا غلام بنا رہتا ہے اور یہی خواہشات ہیں جو اسے دوسروں کا غلام بنانے کے لئے ایک جال کا کام کرتی ہیں۔ یعنی وہ دوسرے لوگ اس کی ان خواہشات اور ہوسنا کیوں کو پورا کرنے کے لیے وسائل فراہم کرتے ہیں اور پھر اس کی پشت پر سوار ہو جاتے ہیں اور اسے جس سمت میں چاہیں چلاتے ہیں۔ لیکن اگر وہ خدا دوست بن جائے اور اللہ تعالیٰ کو ہر چیز سے زیادہ عزیز رکھے اور اسکی خوشنودی کو ہر چیز سے مقدم سمجھے تو وہ اپنی دوسری تمام خواہشات کو کنٹرول کر سکے گا اور انہیں پورا کرنے کے لیے اعتدال کی حد میں رہے گا کہ وہ اسے اپنا اسیر نہ بنالیں اور انسانی کمال کے حصول کے لیے کوشش کرنے کی جو آزادی اسے حاصل ہے اس کو سلب نہ کرلیں اور اسے خدائے تعالیٰ کو یاد کرنے اور اس کی رضا طلب کرنے سے باز نہ رکھیں۔ اس قسم کا انسان بوقت ضرورت حق کی راہ میں اپنی تمام خواہشات کو نظر انداز کر دیتا ہے اور یہ کوشش کرتا ہے کہ خداوند متعال کی رضا حاصل کرے۔ اسی خدائے تعالیٰ کی رضا جس کی خوشنودی اس کی اپنی تمام خواہشات سے بڑھ کر ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ جو اس کی خواہشات کو کنٹرول کرنے کی جزا عالم جاودانی میں بہتر خالص تر صورت میں دے گا۔

”انسانوں کی نظر میں محبت کے قابل چیزوں مثلاً بیویوں، اولاد، سونے چاندی کے ڈھیروں، عمدہ گھوڑوں، چوپایوں اور کھیتوں سے محبت اور الفت سج دھج کے ساتھ جلوہ گر ہوئی ہے۔ یہ سب دنیاوی زندگی کے چند روزہ فائدے ہیں اور ہمیشہ کا اچھا ٹھکانا تو خدا کے یہاں ہی ہے (اے رسول) ان لوگوں سے کہو کہ کیا میں تم کو ان سب چیزوں سے بہتر بتا دوں۔ اچھا سنو جن لوگوں نے پرہیزگاری اختیار کی ان کے لیے ان کے پروردگار کے یہاں بہشت کے وہ باغات ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں اور وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے اور اس کے علاوہ ان کے لیے صاف ستھری بیبیاں ہیں اور (سب سے بڑھ کر تو) خدا کی

خوشنودی ہے اور خدا اپنے ان بندوں کو خوب دیکھ رہا ہے جو یہ دعائیں مانگتے ہیں کہ اے ہمارے پالنے والے ہم تو بلا تامل ایمان لائے ہیں۔ پس تو بھی ہمارے گناہوں کو بخش دے اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا۔ یہ لوگ جو کہ صبر کرنے والے، سچ بولنے والے اور خدا کے احکام پر عمل کرنے والے ہیں خدا کی راہ میں مال خرچ کرتے ہیں اور رات کے پچھلے پہر خدا کی تعریف کرتے اور توبہ واستغار کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں'' (سورہ آل عمران۔ آیات ۱۴ تا ۱۷)

فطرت کے حکم کے مطابق ایک با ایمان انسان دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی ان تمام خواہشات سے تعلق رکھتا ہے لیکن جس چیز کی اہمیت اس کے لیے سب سے زیادہ ہے وہ اللہ تعالیٰ کی رضا ہی ہے۔

''خدا نے ایماندار مردوں اور ایماندار عورتوں سے بہشت کے ان باغوں کا وعدہ کرلیا ہے جن کے نیچے نہریں جاری ہیں اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے بہشت عدن کے باغوں میں عمدہ عمدہ مکانات کا وعدہ بھی فرمایا ہے اور خدا کی خوشنودی ان سب سے بالاتر ہے۔ یہی تو زبردست کامیابی ہے۔'' (سورہ التوبہ۔ آیت ۷۲)

یقیناً ایک با ایمان انسان جو اپنی خواہشات سے آزادی پالے اور اپنا رشتہ خدائے تعالیٰ سے جوڑے وہ پروردگار عالم کو دوسری ہر چیز سے زیادہ عزیز رکھتا ہے۔

''بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو دوسری موجودات کو خدا کا مثل گردانتے ہیں اور جیسی محبت خدا سے رکھنی چاہئے ویسی ہی انسے رکھتے ہیں لیکن صاحبان ایمان ان سے کہیں بڑھ کر خدا سے محبت کرتے ہیں'' (سورہ البقرہ۔ آیت ۱۶۵)

اس خدا دوستی کی بہترین علامت یہی ہے کہ وہ انسان ہر وقت رضائے الٰہی کی راہ میں جان، بیوی بچوں، گھربار اور مال ودولت کی قربانی دینے کو تیار رہتا ہے کیونکہ ان میں سے کوئی چیز بھی اسکے دل میں خداوند عالم کی جگہ نہیں لے سکتی۔

ابدیت سے اتصال:

صاحب ایمان انسان اپنے کو کسی بھی حالت میں تنہا یا بے یارو مددگار نہیں پاتا۔ اسکے برعکس وہ اپنے آپ کو لامحدود ابدیت اور بے حد باشکوہ عظمت اور بے حساب کمال سے وابستہ پاتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو ایسا موجود پاتا ہے جو ابدیت سے وابستہ ہو اور اس کے ساتھ دائمی رشتہ رکھتا ہو۔ ایک ایسا موجود جو ہرگز مکمل طور پر فنا نہیں ہوتا اور حتیٰ کہ اسکی موت بھی درحقیقت اس کی ایک نئی زندگی کے دور کا آغاز ہے۔

رضا عباس علی گڑھ

ادیان ومسالک:

انسانی حقوق اور نہج البلاغہ

اسلام اور نہج البلاغہ کے زاویہ سے حقوق بشر کی تعریف وتوجیہہ کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس نظریہ کے معرض وجود میں آنے سے قبل کے حالات پر ایک سیر حاصل بحث کرلی جائے۔

انسانی تاریخ میں طبقاتی اور نسلی نظاموں کی جڑیں:

اس میں دورائے نہیں کہ بعض فطری عوامل جیسے آب وہوا اور جغرافیائی حالات، انسانی رنگ، نسل، زبان، فرہنگ وغیرہ پر بخوبی اثر انداز ہوتے ہیں۔ اسی بناپر انسانی تہذیب میں مختلف رنگ پیدا ہوئے۔ مختلف زبانیں، مختلف نسلیں اور مختلف کلچر خطۂ زمین پر وجود میں آئے۔ انسانی معاشرہ کی تقسیم تبھی سے شروع ہوگئی جب سے انسان نے انہیں مختلف رنگ ونسل کی بناپر جو یقیناً فطری عوامل کی بناپر پیدا ہوئے تھے، ایک دوسرے پر فخر ومباہات کرنا شروع کیا۔ اس فخر نے بہت جلد تعصب اور پھر نفرت کا روپ اختیار کرلیا اور انسانی سماج میں طبقاتی نظام کی بنیاد پڑگئی۔ پھر یہی تقسیم اور نفرت اقتصادی تقسیم کا باعث ہوئی اور سماج امیر وغریب ثروتمند وفقیر، آقا وغلام جیسے گروہوں میں منقسم ہوگیا۔

جہاں تک تاریخ کی نگاہیں جاتی ہیں اسی نقطے سے ہمیں انسانی معاشرہ کی آپسی کشمکش، طبقاتی تقسیم بندی اور رنگ ونسل کی بناپر تعصبات کے گہرے نشانات نظر آنے شروع ہوجاتے ہیں۔ انسانی تاریخ کے اس صحرا میں انسانی خون کے دریا بڑی روانی کے ساتھ بہتے نظر آتے ہیں۔ دور قدیم سے لیکر آج تک جتنی بھی تہذیبیں وجود میں آئی ہیں ان میں سے ایک

بھی اس تقسیم اور ظلم سے خالی نہیں ہے۔ آیئے ایک نظر ان تہذیبوں پر ڈالیں جنہوں نے اپنے اپنے وقت میں علم وفن اور ادب وہنر میں نقطۂ کمال تک رسائی حاصل کی اور جن کے بوسیدہ کھنڈروں سے آج بھی ان کی عظمت اور شان وشوکت کا پتہ ملتا ہے۔

یونانی معاشرہ:

یونانی تہذیب جو اپنے علم وفلسفہ کی وجہ سے دنیا کی مایہ ناز تہذیب شمار کی جاتی تھی اس میں انسانی سماج تین طبقات میں بٹا ہوا تھا۔

۱۔ طبقۂ غلامان

۲۔ طبقۂ خارجین

۳۔ طبقۂ اتباع

ان میں سے پہلے طبقے کا کام بنا کسی مطالبہ حق کے دوسروں کی خدمت کرنا تھا۔ دوسرا طبقہ جو خارجین کہلاتا تھا ان کے حقوق بھی عام شہریوں کے مقابلے میں بہت محدود تھے، یہ باہر سے آنے والے لوگوں کا طبقہ تھا جنہیں اہالیان شہر پست نظروں سے دیکھتے تھے۔ تیسرا اور آخری طبقہ دراصل تمام سیاسی وسماجی امور میں دخیل اور لوگوں کے سیاہ وسفید کا مالک تھا۔

رومی معاشرہ:

رومی تہذیب بھی سماجی اعتبار سے چار گروہوں میں بٹی ہوئی تھی جن میں سے ایک کو دوسرے پر فوقیت وبزرگی حاصل تھی۔ رومی معاشرہ میں پہلا طبقہ اشراف کا تھا جو اہل حکومت وقضاوت تھے۔ دوسرا طبقہ اہل تجارت کا تھا جو پہلے طبقے سے ذرا کم اہمیت کا حامل تھا اور تیسرا طبقہ غلاموں کا تھا جن کا مقصد زندگی دوسروں کی خدمت اور دوسروں کے لیے کھیتی اور مزدوری کرنا تھا۔ انکی پیدا کی ہوئی کسی بھی شئی پر انکا کوئی مالکانہ حق تسلیم نہیں کیا جاتا تھا۔ چوتھا طبقہ متوسط لوگوں پر مشتمل تھا جو صرف اپنے کام سے کام رکھتے تھے یہ لوگ سخت محنت کرتے تھے اور اس کے عوض ملنے والی چھوٹی سی مزدوری ہی سے اپنی کشتی حیات کو کسی طرح آگے بڑھا

رہے تھے۔اس طبقے کا بھی کسی سیاسی اور سماجی امور میں کوئی دخل نہ تھا۔

ہندو سماج:

ہندو سماج بھی دور قدیم ہی سے برہمن ، چھتریہ، ویشیا، اور شودرا جیسے طبقات میں منقسم تھا ان میں پہلے تین طبقوں کو ہی آریائی نسل تسلیم کیا جاتا تھا جبکہ شودرا کے حقوق سماج میں اتنے محدود تھے کہ انہیں انسان سمجھنا بھی مشکل تھا۔ اگر کسی برہمن پر شودرا کا سایہ بھی پڑ جاتا تھا تو برہمن اپنی پاکیزگی کے لئے غسل کرتا تھا۔ ان طبقات کے لوگوں کا ملنا جلنا اپنے طبقے ہی تک محدود تھا۔ دو طبقوں کے درمیان شادی بیاہ کے روابط کے بارے میں سوچنا بھی ناممکن تھا۔

ایرانی معاشرہ:

مہذب ترین معاشروں میں سرفہرست ایرانی سماج میں بھی روحانیان جنگجویان، کارمندان اور تودۂ ملت جیسے چار مختلف گروہوں میں بٹا تھا جن کے کام اور فرائض ایک دوسرے سے مختلف تھے ۔ طبقہ چہارم جسے تودۂ ملت کہا جاتا تھا وہ سماج کا پست ترین طبقہ تھا جس کے افراد ملعون ومطرود کے نام سے جانے جاتے تھے۔ نچلے طبقے والوں کو مطلق تعلیم حاصل کرنے یا کوئی باعزت کام کرنے کی اجازت نہ تھی۔تعلیم کا حق صرف شاہ زادگان اور اعلیٰ طبقے کے لوگوں کے لئے مخصوص تھا۔

عرب معاشرہ:

نیم متمدن اور اپنی جہالت پر نازاں عرب قبائل بھی سماجی تقسیم بندی طبقہ پرستی میں اپنی مثال آپ تھے۔قبائلی تعصب سے قطع نظر ان کا قومی تکبر اس حد تک بڑھ گیا تھا کہ وہ اپنے سوا تمام عالم کو ''عجم''یعنی ''گونگا'' کے نام سے یاد کرتے تھے۔عرب سماج میں غلاموں پر کئے جانے والے مظالم کو سن کر آج روح انسانیت کانپ اٹھتی ہے۔آج بھی عرب ریڈیو پر

یہ جملہ سنائی دے جاتا ہے کہ ”العزۃ للہ وللعرب“ یعنی عزت صرف ذات خدا اور عربوں کے لئے ہے۔ یہ چھوٹا سا جملہ عرب تعصب اور استکبار کی ایک بڑی دلیل ہے۔

تاریخ بشر میں انسانی خون کی اہمیت:

روم کے کولوسیم (Colosseum) کے افسانے اب تک تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں جس میں ہزار ہا انسان شمشیرزنی کے کمالات اور رومی امراء کے شوق تماشا کی نذر ہو گئے۔ مہمانوں کی تفریح یا دوستوں کی تواضع کے لئے غلاموں کی درندوں سے لڑائی یا انہیں جانوروں کی طرح ذبح کرنا، یا ان کے جلنے کا تماشہ دیکھنا یورپ اور ایشیا کے اکثر ممالک میں کوئی معیوب کام نہ تھا۔ یونان اور روم کے حکماء تک کے اجتہادات میں انسانی جانوں کو بے قصور ہلاک کرنے کی بہت سی وحشیانہ صورتیں جائز تھیں۔ ارسطو اور افلاطون جیسے اساتذۂ اخلاق بھی ماں کو یہ اختیار دیتے تھے کہ وہ جنین کو مار ڈالے، باپ کو اپنی اولاد کو قتل کرنے کا پورا حق حاصل تھا۔ جیورکشا کا گہوارہ ہندوستان ان سب میں بڑھا ہوا تھا، یہاں شوہر کی لاش پر بیوی کو جلنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ شودروں کی جان کی کوئی قیمت نہ تھی، دیوی دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لئے بلی (انسانوں کی قربانی) دینا عام بات تھی۔ ”جل پردا“ کی رسم عام تھی جس کے مطابق ماں باپ اپنے پہلے بچے کو دریائے گنگا کی نذر کر دیتے تھے اور اس قساوت کو اپنے لئے موجب سعادت قرار دیتے تھے۔ عربوں میں بیٹیوں کا پیدا ہونا باعث ننگ و عار تھا لہٰذا انہیں بچپن میں ہی زندہ سپرد خاک کر دیا جاتا تھا۔

اسلام کا انقلابی کردار:

ایسے تاریک ترین دور میں اسلام نے آواز بلند کی کہ ”من قتل نفسا بغیر نفس او فساد فی الارض ...الخ“ یعنی اگر کسی نے نفس کو ناحق قتل کیا تو گویا اس نے پوری انسانیت کو ایک ساتھ قتل کر ڈالا۔ اس آواز نے انسان کو اس کی جان کی صحیح قدر و قیمت سے آگاہ کیا۔ اسلام نے بتایا کہ انسان کی جان اس لئے نہیں کہ اسے شخصی خواہشات کے لئے فنا

کے گھاٹ اتارا جائے یا غلط رسموں کی قربان گاہوں پر اس کی بھینٹ چڑھادی جائے۔ رسولؐ اسلام نے آواز دی کہ آؤ میں تمہیں ایک ایسے حوض کا پتہ بتادوں جس میں غسل کرنے کے بعد تمہارے تمام پچھلے تعصبات ختم ہوجائیں گے اور تمہاری صرف ایک شناخت باقی رہ جائے گی اور وہ یہ کہ تم امت مسلمہ کے ایک فرد ہو۔ یہی وہ اعلان تھا جس نے رنگ و نسل وقبیلہ کے سارے اختلافات مٹا کر آقا وغلام، دولت مند وفقیر، عرب وعجم، قریش وغیر قریش، سفید وسیاہ سب کو کھینچ کر جماعت کی ایک صف میں برابر سے کھڑا کردیا۔ رسولؐ اسلام کا پیغام بنیادی طور پر یہی تھا کہ انسان کو انسان کی غلامی سے آزاد کرکے سب کو اللہ کے حلقۂ بندگی میں داخل کردیا جائے۔ اسلام نے انسان کے ذہن کو پھر اس جانب پھیرا جس سے وہ منھ موڑ بیٹھا تھا چنانچہ ارشاد ہوا۔ ”یا ایھا الناس اناخلقناکم... الخ“ ؎ اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک ہی ماں باپ سے پیدا کیا پھر تمہیں اس لئے مختلف گروہوں اور قبیلوں میں تقسیم کیا تا کہ تم پہچانے جاؤ مگر تمہارے درمیان بزرگی کا حقدار وہی ہے جو زیادہ صاحب تقویٰ ہو۔

انسانی حقوق کی مختصر تاریخ:

تاریخ عالم کی یہ بھی ایک مضحکہ خیز حقیقت ہے کہ حقوق بشر کا پرچم بلند کرنے والے وہی لوگ ہیں جو صدیوں تک انسانی خون چوس چوس کر اپنے آپ کو تازہ وتوانا بناتے رہے۔ وہی استعماری طاقتیں جنہوں نے عرصہ دراز تک کمزور ممالک کے عوام کا عرصہ حیات تنگ کردیا تھا آج انسانی حقوق اور حیات انسان کے لئے اپنے دل میں درد کیوں محسوس کررہی ہیں؟ جب تک یہ مغربی استعماری ممالک دوسروں کے گھروں میں آگ لگا کر اس کا تماشہ دیکھتے رہے انہیں اس پاکیزہ انسانی جذبہ کی مطلق یاد نہیں آئی مگر جب وہی خونی آگ ان کے اپنے گھروں تک پہنچی تو سوائے انسانیت کی دہائی دینے کے ان کے پاس کوئی چارۂ کار نہ رہا۔ اپنے ہی بنائے ہوئے ہتھیاروں کے ڈھیر کے نیچے جب یورپ کے بیشتر ممالک دفن ہونے لگے اور دوسری جنگ عظیم نے ان کے وجود کی نابودی کا خطرہ ان کے سامنے کھڑا کردیا تو نتیجے کے

طور پر اقوام متحدہ'' جیسی تنظیم کا جنم ہوا تا کہ ممکنہ تیسری جنگ عظیم خطہ ارض پر برپا نہ ہو کیونکہ اس جنگ کے رونما ہونے کا مطلب ہوگا بہت سے ممالک کا صفحۂ ہستی سے ہمیشہ کے لئے مٹ جانا۔ چنانچہ اقوام متحدہ کے منشور میں پہلی مرتبہ حقوق انسانی کو ایک دستاویز کی شکل میں مرتب کیا گیا۔ ان حقوق کی اساس وہی بلند انسانی اقدار ہیں جنہیں صدیوں سے نہ صرف اسلام بلکہ تمام مذہبی رہنما اپنی تعلیمات میں بیان کرتے رہے ہیں۔ آج ''حقوق بشر'' کی اصطلاح ایک نعرے کی شکل اختیار کر چکی ہے اور عوام الناس کا تاثر اس سلسلے میں یہی ہے کہ انسانی حقوق کا تصور اور اس کی نشر و اشاعت مغرب ہی کی پیداوار ہے۔

اقوال و کردار امیر المومنین اور انسانی حقوق:

حضرت علی علیہ السلام اس ذات کا نام ہے جس نے آغوش رسولؐ میں اپنی آنکھ کھولی اور رسولؐ نے جن کی آغوش میں اپنی آنکھ بند کی۔ اس لحاظ سے آپ نے اسلام اور رسول اسلام کے انقلابی پیغامات کو سب سے زیادہ نزدیک رہ کر محسوس کیا اور اسے اپنا جزو زندگی، اور مقصد زندگی بنالیا۔ رسولؐ کے بعد امیر المومنینؑ کی پوری حیات پیغام قرآن اور پیغام رسولؐ کو نافذ کرنے کے لئے وقف تھی۔ وہ علم قرآن کے اکلوتے وارث دار اور اسرار پیغمبرؐ اسلام کے امین تھے۔ انسان دوستی کا جو پیغام اسلام نے دیا تھا آپ اس کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ حقوق بشر کے تعلق سے جو بنیادی تین عناصر تسلیم کیے گئے ہیں یعنی ۱۔آزادی ۲۔عدل اور ۳۔مساوات آپ نے ان کو اپنی حیات کا نہ صرف بنیادی اصول قرار دیا بلکہ آخر عمر تک اس کی تبلیغ و ترویج کے لئے کوشاں رہے۔

آزادی:

یقیناً اس لفظ آزادی میں وہ چاشنی ہے جسے ہر ذی شعور انسان محسوس کرتا ہے۔ ہر انسان آج کی دنیا میں آزادی کا خواہاں ہے، جسے دیکھو آزادی کے نعرے لگا رہا ہے۔ اس تصور آزادی پر ایک طرز فکر کی بنیاد بھی پڑی جسے Lilberalism کہا جاتا ہے۔ چونکہ یہ نعرے

مغرب میں وضع ہوئے لہٰذا سبھی نے بغیر سوچے سمجھے اسے ایک فیشن کے طور پر قبول کرلیا۔آج انسانی حقوق کے تعلق سے پہلی بات یہی کہی جاتی ہے کہ دنیا کے سبھی انسانوں کو آزاد ہونا چاہئے۔ اس نظریہ کا نچوڑ یہ ہے کہ انسان آزادی طلب ہے اسے جو کچھ وہ چاہے کرنے کا پورا حق ہونا چاہئے، اسی لئے آج کچھ نوجوان بھی یہ کہتے ہوئے مل جاتے ہیں کہ جو ہمارا جی چاہے گا ہم وہی کریں گے۔ امیر المومنینؑ کا نظریۂ آزادی اس طرز فکر سے یکسر مختلف نظر آتا ہے۔Lilberalism کے نظریہ میں در اصل آزادی نہیں بلکہ ہوائے نفس کی غلامی چھپی ہوئی ہے۔ امیر المومنینؑ کے مطابق آزاد وہ نہیں ہے جو اپنے نفس کی پرستش کرتا ہو، بلکہ آزادی یہ ہے کہ انسان اپنے نفس پر بھی اختیار اور کنٹرول رکھتا ہو تا کہ نفس اسے دھوکہ نہ دے سکے۔ آپ کے متعدد خطبوں اور نصائح میں یہی مفہوم آزادی نظر آتا ہے اور آپ انسانوں کو نفس پرستی کے خطروں سے آگاہ کرتے نظر آتے ہیں۔ آپ کے نزدیک نفس پرستی زرخرید غلام سے بھی زیادہ پست شئی ہے۔ آپ نے فرمایا: ''شہوت کا بندہ غلام سے بدتر ہے۔''[۴]

ایک دوسرے مقام پر آپ نے فرمایا: ''اگر تم نے ہوای نفس کی اطاعت کی تو یہ تمہیں اندھا اور بہرہ بنا کر چھوڑے گی۔''[۵]

آپ کا پیغام آزادی وہ تھا جس میں انسان تمام اقسام کی غلامی سے آزاد ہوکر اللہ کے حلقۂ بندگی میں داخل ہوجائے۔ آپ آزادیٔ فکر کے علمبردار تھے جو آج کے دور میں ایک عنقا شئی ہے۔ ہمارے بدن تو آزاد ہیں مگر ہماری فکریں غلام ہیں۔ آپ ہر قسم کی غلامی کو انسانیت کے لئے باعث ننگ وعار سمجھتے ہیں یہاں تک کہ عبادات میں بھی افضل ترین عبادت اسے شمار کرتے تھے جو ہر طرح کے جذبۂ خوف ولالچ سے پاک ہو: ''ایک جماعت نے اللہ کی عبادت ثواب کی رغبت وخواہش کے پیش نظر کی یہ سوداگروں کی عبادت ہے اور ایک جماعت نے خوف کی وجہ سے اس کی عبادت کی، یہ غلاموں کی عبادت ہے اور ایک جماعت نے از روئے شکر وسپاس گزاری اس کی عبادت کی اور یہ آزادوں کی عبادت ہے۔''[۶] آپ انسانیت کو

ہر اعتبار سے آزاد دیکھنا چاہتے تھے جس کا سر نیاز سوائے خدا کے کسی غیر اللہ کے در پر کبھی خم نہ ہو۔

آج یہ بات تسلیم کی جا چکی ہے کہ کسی بھی انتظامی امر میں سب کو خوش نہیں کیا جا سکتا ہے اور منتظم کو کسی نہ کسی گوشے سے مخالفت کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ امیر المومنینؑ بھی اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے لیکن آپ کا نظریہ تھا کہ نظام عدل میں لوگوں کو خوش رکھنے کی گنجائش نظام ظلم سے کہیں زیادہ ہے لہذا ایک موقع پر آپ نے فرمایا: ''عدل کے تقاضوں کو پورا کرنے میں زیادہ وسعت ہے اور جسے عدل کی صورت میں تنگی محسوس ہو اسے ظلم کی صورت میں زیادہ تنگی محسوس ہوگی۔''[۷]

علیؑ کا نظریۂ عدل اجتماعی اسلام کے فلسفۂ عدل الٰہی کی بازگشت ہے جس کے تحت یہ پورا نظام کائنات اصول عدل کے تحت جاری وساری ہے۔ آپ نے خود متعدد مرتبہ اس کی جانب نہج البلاغہ میں اشارہ فرمایا ہے۔ علیؑ کی خلافت انسان کو اس کے بنیادی حق یعنی انصاف دلانے کی ایک سعی پیہم تھی جسے ایک مقام پر آپ نے اپنی حکومت کا مقصد بھی قرار دیا ہے۔ ''اگر میرے پیش نظر حق کا قیام اور باطل کا مٹانا نہ ہو تو تم لوگوں پر حکومت کے مقابلے میں میری یہ جوتیاں مجھے کہیں زیادہ عزیز ہیں... اب بھی میرا اقدام ویسے ہی مقصد کے لئے ہے تو یہی کہ میں باطل کو چیر کر حق کو اس کے پہلو سے نکال لوں۔ میری قریش سے وجہ نزاع ہی اور کیا ہے۔[۸] آپ نے یہ جملے اصحاب جمل کے لئے کہے ہیں جن کی آپ اصلاح کرنا چاہتے تھے، یہ وہی لوگ تھے جو صرف اس لئے مدینہ سے بھاگ گئے تھے کہ کہیں وہ دولت اور جاگیریں جو ہم نے غاصبانہ طور پر جمع کرلی ہیں ہم سے چھن نہ جائیں۔ آپ کی خلافت کے دوران پیش آئی تمام تر مشکلات کی جڑ یہ تھی کہ آپ گزشتہ بدعنوانیوں کی اصلاح پر مصر تھے۔ آپ ظلم کے معاشرے کو پھر سے انصاف کا معاشرہ بنانا چاہتے تھے ایک ایسا معاشرہ جس میں شخصی امتیازات کا نہیں بلکہ عدل کا بول بالا ہو اور ہر حقدار کو اس کا حق بہ آسانی پہنچ جائے۔ دنیا میں ایسے

حاکم تو بہت ہوئے جنہوں نے حکومت کو بچانے کے لئے حقوق الناس کو بے دریغ پامال کیا مگر یہ علیؑ تھے جنہوں نے عوام کے حقوق کی حفاظت کے لئے حکومت کو قربان کردیا۔ علیؑ کی حکومت کو مورخین نے ناکام لکھا کیونکہ وہ خود اس ظلم کے اتنے خوگر ہوچکے تھے کہ عدل ان کے لئے ایک اجنبی شئی معلوم ہوتا تھا۔ آپ صرف اپنے عدل کی شدت کی وجہ سے محراب عبادت میں شہید ہوئے۔ وہ عدل جو علیؑ کی شہادت کا سبب بنا وہ ایک اجتماعی فلسفہ تھا، ایک طرز حیات جس میں سماج کے ہر طبقہ کے لئے گنجائش تھی۔ آپ نے مالک اشتر نخعی والی مصر کو حکومت کے متعلق جو مکتوب لکھا اس کا ایک ایک لفظ آپ کے عدل اجتماعی کے نظریئے کی تفسیر کرتا ہے: اے مالک! اپنی ذات کے بارے میں اور اپنے خاص عزیزوں اور رعایا میں سے اپنے دل پسند افراد کے معاملے میں حقوق اللہ اور حقوق الناس کے متعلق بھی انصاف کرنا کیونکہ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو ظالم ٹھہروگے اور خدا کے بندوں پر ظلم کرتا ہے تو بندوں کے بجائے اللہ کو اپنا حریف بنانا ہے اور جس کا وہ حریف و دشمن ہو، اس کی پناہ گاہ کہاں ہے۔''

عدل:

حضرت علیؑ سے کسی نے ایک مرتبہ سوال کیا کہ بتایئے عدل بہتر ہے یا جود تو آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ ''عدل بہتر ہے کیونکہ عدل ہر چیز کو اس کے صحیح مقام پر رکھتا ہے اور حق کو اس کے حقدار تک پہنچاتا ہے اور جود و بخشش سے چیزیں اپنی جگہ سے ہٹ جاتی ہیں۹ بظاہر تو یہ بات بہت حسین لگتی ہے کہ جود و احسان عدل سے بہتر ہے، ظاہر ہے کہ اگر کسی کا حق دس روپیے ہے اسے بارہ روپے دے دیئے جائیں تو یہ احسان ہوگیا، یہ تو بہت اچھا ہے، مگر امیر المومنین علی علیہ السلام کا نظریہ شخصی نہیں بلکہ اجتماعی ہے، وہ عدل کو ایک سماجی حقیقت کے طور پر دیکھتے ہیں۔ امیر المومنین جانتے تھے کہ عدل ایک اجتماعی حقیقت ہے جبکہ جود و احسان ایک شخصی، ذاتی اور نجی معاملہ ہے۔ دنیا کا کوئی بھی سماج یا نظام احسان پر نہیں چلایا جاسکتا۔ کوئی System جود و سخا پر نہیں چلایا جاسکتا۔ دو چار دس لوگوں پر تو احسان ہوسکتا ہے مگر پورے سماج

پر احسان نہیں ہوسکتا۔ وہاں پر تو عدل ہی درکار ہے۔ یہاں یہ بات یاد رکھنا چاہئے کہ جود واحسان کے معاملے میں امیر المومنین علی علیہ السلام خود سب سے آگے رہتے تھے مگر اس کے باوجود اس کے درجے کو عدل سے کمتر سمجھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسا جواب وہی دے سکتا تھا جس کی سوچ اجتماعی ہو، جو انفرادی اور ذاتی پیمانوں سے چیزوں کو نہ ناپے بلکہ جو سماجی انصاف کا علمبردار ہو۔

علیؑ کو صرف منصف مزاج کہنا آپ کی منزلت کے ساتھ انصاف نہیں ہوگا۔ آپ منصف مزاج ہی نہیں انصاف طلب بھی تھے۔ علیؑ شدت سے اس بات کے خواہاں تھے کہ کس طرح اسلامی سماج میں عدل وانصاف کے ستون دور رسالت کی طرح پھر سے قائم ہوجائیں۔ علیؑ کی سچی قدر ومنزلت اسی وقت ہمارے سامنے آئے گی جب ہم انہیں ایک انصاف پسند نہیں بلکہ انصاف طلب حاکم کے طور پر دیکھیں۔ زمام حکومت ہاتھ میں لینے کے بعد سب سے پہلا کام جو آپ کرنا چاہتے تھے وہ یہ تھا کہ رسولؐ کی آنکھ بند ہونے کے بعد اور لگاتار فتوحات کے نتیجے میں جو دولت غلط طریقوں سے چند بااثر لوگوں کے خزانوں میں جمع ہوگئی ہے اسے کسی طرح دوبارہ حاصل کرکے مسلمانوں کے درمیان مساوی طور پر تقسیم کیا جائے۔ آپ اسلامی معاشرے میں ثروتمند اور غرباء کے درمیان دلوں میں چوڑی ہوتی جارہی کھائی کو پاٹنا چاہتے تھے۔ اس کے لئے آپ نے نہج البلاغہ میں ایک مرتبہ فرمایا: ”میں لوگوں سے وہ سب کچھ واپس لوں گا جو غلط انداز میں جمع کیا گیا ہے۔ پھر چاہے اس سے لونڈی یا غلام خریدے گئے ہوں یا انہیں عورتوں کے مہر میں دے دیا گیا ہو“۔[۱]

یہی امر اس بات کا باعث ہوا کہ وہ لوگ جو علیؑ کے ہاتھوں پر بیعت کرنے میں پیش پیش تھے آپ کی انصاف طلبی سے خائف ہوکر عہد بیعت توڑ بیٹھے اور بصرہ جاکر فتنہ وفساد کو ہوا دی جس کے نتیجے میں جنگ جمل واقع ہوئی۔

ظلم ہر دلیل کو کچل دے گا... تمہیں سب طریقوں سے زیادہ وہ طریقہ پسند ہونا چاہئے

جو حق کے اعتبار سے بہترین، انصاف کے لحاظ سے سب کو شامل اور رعایا کے زیادہ سے زیادہ افراد کی مرضی کے مطابق ہو... حکمرانوں کے لئے سب سے بڑی آنکھوں کی ٹھنڈک اس میں ہے کہ شہروں میں عدل وانصاف برقرار رہے۔''[۱۱]

مساوات:

گذشتہ مباحث میں ہم نے دیکھا کی دنیا کہ تمام مہذب اور غیر مہذب تہذیبیں قبل اسلام کس طرح طبقات اور رنگ ونسل کی برتری جیسی مہلک اجتماعی بیماریوں میں گرفتار تھیں۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ اسلام نے آکر اسی اونچ ونیچ اور افتخارات کے خلاف جنگ شروع کی اور تمام مادی تفاخرات سے انکار کیا۔ اسلام کی اس صدائے مساوات نے پسماندہ اور ضعیف بنادیئے گئے طبقوں میں جادو کا سا اثر کیا جبکہ طبقاتی نظام کے علمبردار اسلام کے شدید دشمن ہوگئے۔ پیغمبرؐ اسلام کی پوری حیات اسی اونچ نیچ کو ختم کرنے کی جدوجہد سے عبارت ہے۔ حج آخر کے بعد آپ نے مسلمانوں کو مخاطب کیا اور فرمایا'' اے لوگوں تمہارا خدا ایک ہے تم سب اولاد آدم ہو اور آدم خاک سے پیدا کئے گئے تھے۔ لہذا کسی کو کسی پر کوئی فضیلت نہیں ہے، نہ عرب کو عجم پر، نہ سیاہ کو سفید پر، تم میں اگر کوئی صاحب فضیلت ہے تو وہ صاحب تقویٰ ہے۔''[۱۲]

حضرت علیؑ یہ دیکھ رہے تھے کہ پیغمبرؐ کے بعد اسلام کی روح مساوات پر مسلسل زخم لگائے جارہے ہیں اور لوگوں میں پھر سے پرانے تعصبات وتفاخرات کے جراثیم ماحول سازگار پاکر ظاہر ہونا شروع ہوگئے ہیں۔ لوگ اپنے آبا واجداد اور اپنی قوم پر فخر ومباہات کا اظہار کررہے ہیں۔ انہیں حالات میں ایک مرتبہ آپ نے لوگوں کو مخاطب کرکے فرمایا: ''کیا اپنے آباء واجداد کی قبروں پر فخر کررہے ہو؟'' ایک دوسرے مقام پر آپ نے فرمایا: ''جس کی اپنی خود کی کوئی شخصیت نہیں ہوتی وہ اپنے باپ دادا کی شخصیت اور مقام سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔''[۱۳]

امیر المومنینؑ اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے کہ سماج کی صحت کا تمام تر دارومدار اس کے افراد کے درمیان عدل ومساوات پر ہے۔ اسلئے آپ نے ایک بشر اور ایک حاکم دونوں حیثیتوں سے اس حقیقت کی جانب لوگوں کو متوجہ کیا۔ گھر کے اندر اصول مساوات کا لحاظ اس طرح رکھا کہ گھر کی خادمہ فضہ اور مالکہ فاطمہ دونوں ایک ایک دن گھر کا کام کرتی تھیں اور اس میں ذرہ برابر بھی کوئی امتیاز نہ تھا۔ حضرت قنبر کے ساتھ جس نے اپنے اختیار سے حضرتؑ کی غلامی کو آزادی پر ترجیح دی تھی آپ کا برتاؤ ایسا تھا جیسا کہ ایک شفیق باپ کا اپنے مطیع فرزند کے ساتھ ہوتا ہے۔

ایک حاکم کی حیثیت سے آپ کی کوشش یہی تھی کہ بندگان خدا کے درمیان روح مساوات مجروح نہ ہونے پائے۔ آپ اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے کہ عدل کے قیام سے پہلے مساوات کا قیام ضروری ہے اسی لئے ایک مقام پر آپ نے فرمایا: "دو آدمیوں میں ایک کا حق دوسرے پر اس وقت ہے جب دوسرے کا بھی اس پر حق ہو اور اس کا حق اس پر جب ہی ہوتا ہے جب اس کا حق اس پر بھی ہو"[۱۲]

ایک حاکم اپنی حکومت عادلانہ اصولوں پر تب ہی قائم کرسکتا ہے جب وہ رعیت کو ایک نگاہ سے دیکھے، جس حکومت میں رعیت کو مساوی حقوق حاصل نہ ہوں وہاں عدل وانصاف کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ امیر المومنینؑ اس امر میں بہت محتاط نظر آتے ہیں اور اکثر وبیشتر اپنے عمال کو خطوط کے ذریعے آگاہ کیا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ کہیں تمہاری بے توجہی کی وجہ سے کوئی غریب ونادار تمہارے انصاف سے مایوس نہ ہوجائے۔ دوسری خلافت کے زمانے میں آپ نے ایک عیسائی پر مقدمہ دائر کیا اور مقدمے کے دوران خلیفۂ ثانی نے آپ کو "ابوالحسن" کہہ کر مخاطب کیا تو آپ نے اسے سخت ناپسند فرمایا اور اسی وقت خلیفہ کو مخاطب کرکے کہا آپ نے اسے تو نام سے پکارا اور مجھے میری کنیت سے جو انصاف کے لئے ٹھیک نہیں ہے کہیں یہ عیسائی آپ کے انصاف سے مایوس نہ ہوجائے۔ قانونی شریعت کے سامنے

مدعی اور مدعا علیہ دونوں کی حیثیت برابر ہونی چاہئے۔"

جس وقت آپ نے حاکم وقت کی حیثیت سے زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی تو پچھلی خلافتوں کے امتیازی سلوک کی وجہ سے لوگوں میں اس کی عادت پڑ چکی تھی۔ خلفیہ ثانی نے وظائف تقسیم کرنے کے سلسلے میں اسلام کے اصول مساوات کو طاق پر رکھتے ہوئے مسلمانوں میں طبقاتی نظام کی داغ بیل ڈالی۔ پہلا طبقہ ازواج رسولؐ کا تھا جنہیں سب سے زیادہ وظیفہ ملتا تھا اور اس میں حضرت عائشہ کو دوسروں پر فضیلت حاصل تھی اور ان کا وظیفہ عام ازواج رسول سے زیادہ مقرر کیا گیا تھا۔ اس طرح مہاجرین کو انصار پر، بدر میں شرکت کرنے والوں کو بعد کے مسلمانوں پر فضیلت دی گئی اور ان کے الگ الگ وظیفے معین کئے گئے۔ آپ نے اپنے دور میں جب اس عمل کی اصلاح کے لئے بیت المال کی مساوی تقسیم شروع کی تو اصحاب کبار کی پیشانیوں پر بل پڑ گئے۔ آپ نے انہیں لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا: "کیا تم مجھ پر امر عائد کرنا چاہتے ہو کہ میں جن لوگوں کا حاکم ہوں ان پر ظلم وزیادتی کر کے (کچھ لوگوں کی) حمایت حاصل کروں۔ تو خدا کی قسم جب تک دنیا کا قصہ چلتا رہے گا اور کچھ ستارے دوسرے ستاروں کی طرف جھکتے رہیں گے۔ میں اس چیز کے قریب بھی نہیں بھٹکوں گا اگرچہ میں خود عمال ہوتا تب بھی میں اسے سب میں برابر تقسیم کرتا چہ جائیکہ یہ مال اللہ کا مال ہے۔[۱۵]

حق حیات ورزق:

چونکہ امیر المومنینؑ تعلیمات اسلامی کی منہ بولتی تصویر تھے لہٰذا انسانی حیات کے بارے میں آپ کا وہی نظریہ ہے جس کا اعلان قرآن کی متعدد آیتوں میں کیا گیا ہے۔ قرآن کے مطابق ہر ذی روح کو نہ صرف خالق نے جینے کا حق دیا ہے بلکہ اس کی روزی کا ذمہ بھی اپنے اوپر لیا ہے۔ یہ خلعت حیات جو اس نے اپنی مخلوق کو عطا فرمایا ہے یہ اس کی دی ہوئی ایک بڑی نعمت ہے جسے چھیننے کا اس نے کسی کو اختیار نہیں دیا ہے۔ قتل وخون میں ڈوبی ہوئی دنیا کو اسلام نے آواز دی: "لاتقتلوا النفس .... بالحق" کسی نفس کو بغیر اسپر حق قائم

کیے ہوئے ہرگز قتل نہیں کیا جاسکتا۔(1) یہاں یہ بتانا ضروری ہے اسلام میں انسانی جان کی اہمیت واحترام اس وقت تک ہے جب تک وہ حق پر دست درازی نہ کرے۔

اس میں دو رائے نہیں کہ امیر المومنینؑ نے اپنی زندگی میں سیکڑوں لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارا مگر یہ بھی سچ ہے کہ آپ کی تلوار صرف انہیں لوگوں کے سروں پر بلند ہوئی جنہوں نے یا تو حق پر دست درازی کی یا جارحانہ طور پر تلواریں لیکر چراغ اسلام کو گل کرنے کی نیت سے حملہ آور ہوئے۔ آپ نے اپنی زندگی میں جتنی جنگیں لڑیں وہ سب آپ پر تھوپی گئیں تھیں۔ کسی بھی جنگ میں آپ نے خود کسی پر حملہ نہیں کیا۔

امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی زندگی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ آپ رات کی تاریکی میں روٹیاں لیکر فقیر ونادار لوگوں تک پہنچایا کرتے تھے۔ جب آپ روٹیوں کی گٹھری لیکر نکلتے تھے تو آپ کی نگاہیں مسلمان یا مومن کی نہیں بلکہ انسان اور انسانی زندگی کی تلاش کرتی تھیں اور جہاں کوئی ذی روح نظر آتا آپ اسے شکم سیر فرماتے اس لئے کہ اللہ نے حیات اور رزق ہر ذی روح کا حق قرار دیا ہے۔ آپ نے کبھی میدان جنگ میں بھی مدمقابل کے لئے دانہ وپانی کے راستے بند کرنے جیسی کوئی تدبیر اختیار نہیں کی۔ جنگ صفین کے موقع پر لشکر شام نے صفین میں پہلے پہنچ کر فرات کے گھاٹ پر قبضہ کرلیا اور لشکر علیؑ کو پانی لینے سے روک دیا اس مقام پر آپ نے اپنے ساتھیوں کو خطبہ دیا جس کے بعد آپ کے لشکر نے آگے بڑھ کر فرات کو دشمنوں کے قبضے سے چھین لیا، اب اصول جنگ کا تقاضہ تو یہ تھا کہ آپ بھی دشمنوں کو پانی لینے سے روک دیتے مگر آپ کی انسان دوستی اور رحم دلی نے یہ گوارا نہ کیا کہ کسی انسان پر چاہے وہ دشمن ہی کیوں نہ ہو بندش آب کی جائے آپ نے کھلا اعلان فرمایا کہ جسے بھی پانی لینا ہو وہ بے روک ٹوک فرات سے پانی لے لے ہم کسی پر پانی بند کرکے جنگ جیتنا نہیں چاہتے۔

ایک حاکم کے طور پر آپ نے اپنی حکومت میں بلا تفریق مذہب اپنی رعایا کے حقوق

کی حفاظت کی خصوصاً اس طبقے کی جسے عام طور پر کبھی انصاف نہیں ملتا۔ مالک اشتر کے نام لکھے اپنے خط میں آپ نے اسی جانب انہیں متوجہ کیا" دیکھو یتیموں اور سال خوردہ بوڑھوں کا خیال رکھنا، جو نہ کوئی سہارا رکھتے ہیں اور نہ سوال کے لئے اٹھتے ہیں اور یہی وہ کام ہے جو حکام پر گراں گزرا کرتا ہے۔ اور تم اپنے اوقات کا ایک حصہ حاجتمندوں کے لئے معین کر دینا جس میں سب کام چھوڑ کر انہیں کے لئے مخصوص ہو جانا اور ان کے لئے ایک عام دربار کرنا اور اس میں اپنے پیدا کرنے والے اللہ کیلئے تواضع وانکساری سے کام لینا اور فوجیوں، نگہبانوں اور پولیس والوں کو ہٹا دینا تا کہ کہنے والے بے دھڑک کہہ سکیں، کیونکہ میں نے رسولؐ اللہ کو فرماتے سنا ہے کہ، اس قوم میں پاکیزگی نہیں آسکتی جس میں کمزوروں کو کھل کر طاقتوروں سے حق نہیں دلایا جاتا۔" [۷]

حوالے:

۱۔تمدن اسلام وعرب

۲۔قرآن ( )

۳۔قرآن (۴۹:۱۳)

۴۔غرر الحکم ص ۴۹۸

۵۔نہج البلاغہ

۶۔نہج البلاغہ کلمات قصار نمبر ۲۳۷

۷۔نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۱۵

۸۔نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۳۳

۹۔نہج البلاغہ کلمات قصار نمبر ۴۳۷

۱۰۔نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۱۵

۱۱۔نہج البلاغہ مکتوب نمبر ۵۳

۱۲۔روح الدین اسلامی ص ۲۷۵
۱۳۔الامام علی صوت العدالہ الانسانیہ جلد دوم ص ۷۴۴
۱۴۔نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۲۱۴
۱۵۔نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۱۲۴
۱۶۔قرآن
۱۷۔نہج البلاغہ مکتوب نمبر ۵۳

پروفیسر سید جعفر رضا

اسلامی فرقے

(مختلف اسلامی مسالک کا اجمالی تعارف)

مہدیین:

مہدیین، عربی جمع (واحد مہدی) ہادی، رہنما، پیشوا، اور رہبر یا امام آخر جن کا ظہور قرب قیامت میں ہوگا۔ مہدیین کوئی ایک مسلک یا فرقہ نہیں ہے بلکہ اس سے مراد مختلف شخصیتیں ہیں، جو امام آخر الزماں ہونے کا دعویٰ کرتی رہیں جن کے متبعین کی الگ الگ جماعتیں ہیں۔ ان مہدیین میں بعضوں کے دعوے محض امام ہونے تک محدود رہے لیکن بعضوں نے امام کے علاوہ رسول ہونے کا دعویٰ بھی کرتے رہے ہیں۔

اسلام کا قطعی قانون ہے کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آخری نبی ورسول ہیں۔ ان کے بعد نبوت ورسالت کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ اس لیے وہ مہدیین جو امامت کے علاوہ نبوت ورسالت کے دعویدار ہیں، ان کے دائرہ اسلام میں باقی ہونے میں کلام کیا گیا ہے حالانکہ ان مہدیین کی اپنی دلیلیں اور براہین ہیں، جن پر تفصیلی بحث کا یہاں موقع نہیں۔ ہم نے ان کو اسلامی فرقوں میں محض اس بنا پر شمار کیا ہے کہ وہ خود کو اسلامی فرقہ کہتے ہیں۔

مہدی موعود کے بارے میں قرآنی آیات سے دلیل پیش کی جاتی ہے:

ودین الحق لیظھرہ علی الدین کلّہ (اور دین حق کے ساتھ بھیجا تا کہ اپنے دین کو تمام ادیان پر غالب بنائے: التوبہ ۹/۳۳) یہ آیت کئی بار نازل ہوئی جس میں دین حق کو تمام دیگر ادیان پر غالب آنے کی خبر دی گئی۔ (الفتح ۴۸/۲۸، الصف ۶۱/۹) مفسرین کا بیان

ہے کہ اگر چہ حیات پیغمبر میں اسلام ساری طاقتوں پر غالب آچکا تھا لیکن دیگر طاقتوں کا خاتمہ مہدی موعود کے ذریعہ ہوگا، جس کی اس آیت میں بشارت دی گئی۔ دوسری جگہ مہدی موعود کو بقیت اللہ (اللہ کی طرف کا ذخیرہ: ھود ۱۱/۸۶) کہا گیا، جس سے ثابت ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ نے بچا کر غیب میں رکھا ہے، جو وقت مقررہ پر ظہور کرے گا۔ اس کے دور میں دین اسلام کا غلبہ ہوگا۔ اور خوف امن میں تبدیل ہوجائے گا:

ولیمکنن لھم دینھم الذی ارتضیٰ لھم ولیبدلنّھم من بعد خوفھم۔ (اور ان کے لئے اس دین کو غالب بنائے گا جسے ان کے لئے پسندیدہ قرار دیا ہے اور ان کے خوف کو امن سے تبدیل کردے گا: النور ۲۴/۵۵)

اسلامی عقاید وافکار میں تصور مہدی پر احادیث میں بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان میں بعض عقاید وافکار مختلف فرقوں کے درمیان مشترک ہیں اور چند تصورات کسی فرقہ سے مخصوص ہیں۔ ذیل میں ان عقاید وافکار کا ذکر کیا جاتا ہے، جو اہل تشیع واہل تسنن کے درمیان فرقہ سے مخصوص ہیں:

۱۔ امام مہدی نبی فاطمہ سے ہوں گے۔ ان کا نام محمد ہوگا۔ وہ اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ ہوں گے۔ (النور ۲۴/۵۵)

۲۔ امام مہدی بقیت اللہ ہوں گے جن کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت کے لئے بچا کر رکھا ہے۔ (ھود ۱۱/۸۶)

۳۔ امام مہدی دین حق قائم کریں گے۔ دیگر ادیان پر غالب ہوں گے۔ (النور ۲۴/۵۵)

۴۔ امام مہدی دنیا میں امن وامان قائم کریں گے۔ (النور: ۲۴/۵۵) ان کی حکومت کی مدت سات، نو یا انیس سال ہوگی۔

۵۔ امام مہدی قیامت سے قبل ظہور کریں گے۔ ان کے علم کا رنگ سیاہ ہوگا جو

خراسان میں بلند ہوگا۔ اگر تم سیاہ علم دیکھو تو اس کے پاس پہنچو خواہ تمہیں برف پر رینگنا پڑے کیونکہ اس کے ہمراہ امام مہدی ہوں گے، جو اللہ تعالیٰ کے نائب غیب ہوں گے۔

۶۔ امام مہدی کے زمانہ ظہور میں دجال یک چشم ہوگا، جو مشرق میں ہوگا۔ اسی زمانہ میں سفیانی اور یمنی بھی ہوں گے۔

۷۔ امام مہدی کی مخالفت عربوں میں خاص طور پر قریش کریں گے، جن کی جائیدادوں پر غیر ملکیوں کا قبضہ ہوگا۔ امام مہدی غیر ملکی تسلط ختم کردیں گے۔

امام مہدی سے متعلق واضح بیانات کے باوجود مختلف فرقوں میں متعدد افراد عہد بہ عہد امام مہدی ہونے کا دعویٰ کرتے رہے ہیں۔ ان میں اولین نام مسلک زیدیہ کے امام پھر مسلک اسماعیلیہ کے امام المہدی عبید اللہ (م۔ ۹۰۷ء) ہیں۔ اہل تشیع کے ضمنی مسالک جو اپنی ٹمٹماتی روشنی دکھاکر جلدی خاموش ہوگئے، اور جن کا ذکر گذشتہ صفحات میں آچکا ہے، امام مہدی ہونے کے دعویداروں سے بھرے ہیں۔ لیکن اہل تشیع کے اکثریتی مسلک امامیہ یا اثنا عشری میں امام مہدی کا تصور امام آخر الزماں سے وابستہ ہے۔ اس لیے مسلک امامیہ ان مدعیان عصر کو قبول نہیں کرتا لیکن مسلک امامیہ میں بھی عہد بہ عہد امام مہدی کے دعویدار ہوتے رہے ہیں۔ اہل تسنن میں مہدیت کا زور اہل تشیع سے کم نہیں رہا ہے عہد بہ عہد امام مہدی ہونے کے دعویدار ابھرتے رہتے ہیں۔ ان میں زیادہ تر وقتی اثر ونفوذ کے بعد خارج ہوجاتے ہیں لیکن بعضوں کے دعوؤں کی بنیاد پر نئے مسالک یا فرقے اور بعض صورتوں میں مذاہب وجود میں آگئے۔ ان مسالک، فرقوں یا مذاہب کو دائرہ اسلام میں قبول کیا جائے یا نہیں، ان پر قدیم میں بحثیں ہوئی ہیں، جن میں بعض بحثیں خون ریزی کا باعث ہوئی ہیں۔ ماضی قریب میں بھی ایسی بحثیں ہوئی ہیں، اور ان کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ ذیل میں ان مسالک یا فرقوں کا ذکر کیا جائے گا، جو خود اسلامی مسلک یا فرقہ ہونے کی دعویدار ہیں۔ وہ کسی حد تک اسلامی ہیں یا نہیں، یہ طے کرنا ہمارے حیطہ اختیار سے باہر ہے۔

مبیضہ یا نخشبی:

مبیضہ، بمعنی سفید پوش، چونکہ اس فرقہ کے لوگ ہمیشہ سفید کپڑے پہنتے تھے، یہی اس فرقے کا نام ہوگیا اس فرقے کا موسس ہاشم بحکیم (م۔ ۱۶۳ھ/۷۷۹ء) مقنع کے نام سے معروف ہے۔ مقنع بمعنی نقاب پوش نام پڑنے کا سبب تھا کہ وہ ہمیشہ چہرہ پر ایک زریں نقاب ڈالے رہتا تھا۔اس فرقہ کا دوسرا نام نخشبی ہے۔ جو ماہ نخشب کی رعایت سے مشہور ہوا۔ اس کا بانی مقنع شعبدہ اور علم نیرجات وطلسمات میں ماہر تھا۔ پہلے امام مہدی ہونے کا دعویٰ کیا، پھر پیغمبری کا۔ اپنا معجزہ ماہ نخشب کو قرار دیا۔ اس کی حقیقت یہ تھی کہ اس نے چاند کی شکل کا ایک جسم بنایا اور لوگوں کو دکھایا کہ وہ جسم ماوراالنہر کے مشہور شہر نخشب کے علاقہ میں ایک کنویں سے برآمد ہوکر کچھ دور تک بلند رہتا ہے، پھر اس کنویں میں غروب ہوجاتا۔ بعد میں لوگوں نے کنویں کی تہ سے ایک بڑا پیالہ برآمد کیا، جو پارہ سے لبالب بھرا ہوا تھا۔ ابن الاثیر کا بیان ہے کہ مقنع نے بعد میں خدائی کا دعویٰ کیا لیکن اس کا اظہار عام طور پر نہیں کرتا تھا بلکہ اپنے عقاید اس طرح بیان کرتا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو خلق کیا تو ان کی صورت میں منتقل ہوگیا، پھر حضرت نوح کی شکل میں منتقل ہوا، بعد عہد بہ عہد مختلف شکلوں میں منتقل ہوکر ابومسلم خراسانی کی شکل میں منتقل ہوا اور موجودہ صورت میں ہاشم ابن حکیم معروف بہ مقنع کی شکل میں ہے۔ ۳؎ ابو مسلم خراسانی سے مقنع کو خصوصی عقیدت تھی کہ وہ ابومسلم کو پیغمبر سے افضل قرار دیتا تھا، بعض کہتے ہیں کہ وہ ابومسلم کو خدا مانتا تھا۔ وہ تناسخ کا قائل تھا اور دعویٰ کرتا تھا کہ ابومسلم کی روح اس کے جسم میں حلول کرگئی ہے۔فرقہ مبیضہ کے متعلق کتنی ہی غلط سلط روائتیں رائج ہیں۔ جن پر آسانی سے یقین نہیں کیا جاسکتا۔ ان پر داستانی رنگ غالب ہے۔ ابومسلم خراسانی کے حوالہ سے صحیح طور پر اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس فرقہ کو رسوا کرنے کے لیے بنی عباس کی سرکاری مشینری بھی کام کرتی رہی ہوگی۔ واللہ اعلم بالصواب، مقنع کی موت کے متعلق بھی داستانیں ہیں۔لیکن اتنی بات تاریخوں میں درج ہے کہ عباسی خلیفہ المہدی کے حکم پر ۱۶۱ھ/۷۷۷ میں

ایک بھاری فوج نے مقنع سے جنگ کی، جس سے دو برس تک جنگ وجدال کے نتیجہ میں مقنع مارا گیا۔زیادہ تر مورخین کا خیال ہے کہ قلعہ سنام پر عربوں کے تسلط سے قبل ہی اس نے خود کو ہلاک کرلیا۔مقنع کی موت کے بعد بھی عرصے تک ماوراالنہر کے علاقہ میں فرقہ مبیضہ کے لوگ موجود تھے، جو بعد کے ادوار میں دوسرے فرقوں میں مدغم ہوگئے۔

مہدویہ:

اس فرقہ کے موسس سید محمد جون پوری (۱۵۰۵ء۔۱۴۴۳) ہیں۔جنھوں نے ابتداء ایک اصلاحی تحریک کے ذریعہ مسلم معاشرہ کی خرابیوں کو دورکرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے مسلمانوں کو سمجھایا کہ انسان اور خدا کے درمیان دوری قائم کرنے والی شے دنیا ہے۔ اس لیے دنیا کو ترک کرکے زہد وورع پاکیزگی نفس اورقرآن وسنت کی حرف بہ حرف پیروی لازمی ہے۔ ان کی اصلاحی تحریک مسلم معاشرہ میں خاطر خواہ مقبول ہوئی۔ ۴۵ سال کی عمر میں حج بیت اللہ کے موقع پر مکہ مکرمہ میں ۱۲ر ذی الحجہ ۹۰۱ھ/ ۲۲راگست ۱۴۹۶ء کو پہلی بار دعویٰ مہدیت کا اعلان کیا، پھر ہندوستان لوٹ کر احمد آباد میں دسمبر ۱۴۹۷ء میں دوبارہ اعلان مہدیت کیا، بعدہٗ ۵۸ سال کی عمر میں دسمبر ۱۴۹۹ء میں سہ بارہ اعلان مہدیت کیا۔ اس فرقہ کے لوگ انھیں احتراماً امامنا مہدی موعود علیہ السلام کہتے ہیں۔تعلیمات مہدویہ کے دو پہلو ہیں، جو احکامات قرآنی کے تحت فرائض وواجبات پر مشتمل ہیں۔ اولاً وہ احکام جو نبوت کے دائرہ عمل میں ہیں، ان کی وضاحت مکمل طور پر پیغمبر اسلام نے کردی ہے اور اسی کے اعتبار سے عمل پیرا ہونا ہوگا۔ ثانیاً وہ احکام جو ولادیت محمدیہ سے متعلق ہیں، جن کو خاتم ولایت محمدیہ سید محمد جون پوری نے فرض قرار دیا ہے اور جو حسب ذیل ہیں:

۱۔ ترک دنیا: دنیا تیرا نفس ہے، نفس کو فنا کردیا تو دنیا اثر انداز نہیں ہوسکتی۔

۲۔ صحبت صادقان: ان صادقوں کی صحبت اختیار کرو جو عمل صالح، معرفت علم اورشرعی اصولوں کی عملی تربیت دے سکیں۔

۳۔ غزلت از خلق: اہل دنیا سے بچو اور گوشہ نشینی اختیار کرو۔

۴۔ ذکر کثیر: ہر لحہ ذکر خدا کیا کرو۔

۵۔ توکل: اس کا مقصد رضائے الٰہی ہو، رزق پر اکتفا کرنا نہیں ہوگا۔

۶۔ طلب دیدار خدا: انسان کے وجود کی علت غائی ہے۔ طلب صادق ہے تو اللہ تعالیٰ کا دیدار لازمی ہے۔

۷۔ ہجرت: وطن کی محبت دین کے لئے قربانی کرنے سے روکتی ہے، اس لیے ہر شخص کو برابر ہجرت کرتے رہنا ہوگا۔

۸۔ عشر: آمدنی کا دسواں حصہ راہ خدا میں دینا۔ اس کے بعد ہی اس کی کمائی پاک ہوسکے گی۔ اس لیے فقر اور سویت کو لازمی قرار دیا۔ سویت عشر کے طور پر حصہ میں آئی ہوئی چیز کو کہتے ہیں۔

سید محمد مہدی کے خلیفہ اول سید محمد ثانی مہدی (م: ۹۲۰ھ/ ۱۵۱۴) ہوئے، خلیفہ دوم سید خوندمیر (۹۳۷ھ/ ۱۵۲۴ء) جو سید محمد مہدی کے داماد تھے۔ ان کو مع ساٹھ ہمراہیوں کے مظفر شاہ کی افواج نے شہید کیا۔ ان کا سر پٹن میں، جسم مدراس میں اور پوست چاپانیر میں مدفون ہیں۔ [۴] مسلک مہدویہ کو سلاطین دہلی میں خاندان سوری کے دور حکومت میں خصوصی مقبولیت حاصل تھی۔ بقول بدایونی مسلک مہدویہ کے مختلف حلقے قائم تھے۔ جن میں اس زمانہ کے دو متعدد علماء شیخ علائی (شہید ۱۵۴۸ء) اور میاں عبد اللہ نیازی (م ۱۰۰۱ھ/ ۱۵۹۲ء) شامل تھے۔ ابو الفضل، فیضی اور ان کے باپ شیخ مبارک بھی متاثر تھے۔ [۵] اس سے بالواسطہ طور پر سہی لیکن اکبر اعظم کی مذہبی حکمت کی تشکیل میں مہدویت کے اثرات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ دکنی اردو کا مشہور شاعر ہاشمی بیجاپوری (۱۰۷۸ھ/ ۱۶۶۷) بھی مہدوی تھا۔ ہجرت کو اصل مذہب کی حیثیت سے قبول کرنے کی بنا پر مہدویت دنیا کے مختلف ممالک میں رائج ہے۔ ہندوستان میں اس کا مرکز حیدرآباد ہے۔

روشنیہ:

اس فرقہ کے بانی میاں بایزید انصاری ۹۳۲ھ/ ۱۵۲۵ میں جالندھر (ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ ابتداً مغل فوج میں سپاہی تھے۔ افغانیوں میں مغلوں کے خلاف تحریک چلائی اور اپنا الگ فرقہ بنالیا جو روشنیہ کہلایا، خود کو مہدی موعود بتایا، پیر روشن کے نام سے مشہور ہوئے۔ یہ فرقہ لوٹ مار اور قتل کو جائز قرار دیتا تھا۔ یہ بات قبائلوں کو پسند آئی۔ انھوں نے دل وجان سے فرقہ روشنیہ قبول کیا اور اور تن دعی سے سرگرم عمل ہوئے۔ اس کا مخالف ملا اخوند درویزہ تھا۔ اسنے پیر روشن کا مقابلہ کیا۔ وہ اس کو پیر تاریک کہتا تھا۔ مغل فوجوں سے کئی بار مقابلہ ہوا۔ آخر میں پیر روشن قتل ہوا لیکن اس فرقے کے لوگ قبائلی علاقوں میں باقی رہ گئے، جو بعد کے ادوار میں اہل تسنن میں مدغم ہوگئے۔ بدایونی فرقہ نے روشنیہ کے متعلق لکھا ہے کہ اس کے عقاید بھی رائج تھے۔ روشنیہ عرش کو پیغمبر ہی نہیں، خدا کا درجہ دیتے۔ نماز پڑھتے تھے لیکن قبول کی شرط نہ تھی۔ غسل کے لیے پانی کو ضروری نہ مانتے تھے۔

بہائی:

اس فرقہ کی بنیاد اوائل ۱۹ ویں صدی میں یوں پڑی کہ ملا مرزا علی محمد نے باب ہونے کا دعویٰ کیا۔ باب مسلک امامیہ یا اثنا عشریہ میں ایک منصب ہے، جس پر غیبت امام آخر الزماں ۲۶۰ھ/ ۸۷۳ء) کے اولین دور (۹۴۰-۸۷۳ء) میں یکے بعد دیگرے نواب اربعہ فائز ہوئے، جو باب بھی کہے گئے، کیونکہ وہ امام زمانہ تک رسائی کا ذریعہ تھے۔ ملا مرزا علی محمد کا دعویٰ پانچواں باب ہونے کا تھا، جس کو ایک حلقہ نے قبول کیا، جو اس وقت کے شیعی علماء سے مطمئن نہیں تھا۔ اس حلقہ کو وسعت حاصل ہوئی تو مرزا علی محمد نے دعویٰ کیا کہ اصلاً وہی مہدی الآخر زماں ہیں۔ پھر دعوائے رسالت کیا۔ اس کے پیروؤں میں خاص طور پر فارسی کی مشہور شاعرہ قرۃ العین شامل تھی۔ ملا مرزا علی محمد کو مرتد قرار دے کر ۱۸۵۰ میں قتل کردیا گیا۔ اس کے پیرو بھی قتل ہوئے، جن میں قرۃ العین شامل تھی۔ ابتداً یہ لوگ بابی کہلائے۔ انھیں بابیوں میں

مرزا حسین علی معروف بہ بہاء اللہ نے ۱۸۷۶ء (یا ۱۸۶۳ء) میں منجانب اللہ اپنے باب مقرر ہونے کا اعلان کیا اور مذہب بہائی کی ابتداء کی۔ بہائیوں کا عقیدہ ہے کہ بہاء اللہ پر الٰہی پیغام رسائی کا خاتمہ ہوگیا۔ جس میں مسیح، محمد، زرتشت اور بدھ شامل تھے۔ اس عقیدہ کے مطابق بہائیت کے ذریعہ عی بہاء اللہ کی بدولت تکمیل حاصل ہوگئی۔ اب کوئی اور مہدی موعود نہیں آئے گا۔ بہائی رہنماؤں میں تیسری اہم شخصیت عبد البہا (م: ۱۳۴۰ھ ۱۹۲۱ء) کی تکمیل مذہب کی آخری شرط بھی پوری کردی۔

بہائی عقیدہ کی اساس وحدت مذاہب پر قائم ہے۔ جس میں تمام مذاہب شامل ہیں۔ وہ بیک وقت ایرانی مذہبی رہنما زردشت، بھگوان کرشن، حضرت عیسیٰ پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ کی مذہبی رہنمائی قبول کرتے ہیں لیکن بہاء اللہ کی آمد ان کے مذاہب کے خاتمے کا اعلان مانتے ہیں۔ اب فقط بہائیت ہے اور اسی میں تمام مذاہب کی روح شامل ہے۔ بہائیوں کے عقیدہ کی دیگر اساس وحدت بنی نوع انسان ہے۔ ان کا زور ہے کہ تمام انسان ایک ہیں ان میں کسی بنیاد پر تفریق نہیں کی جاسکتی بہائیوں نے اپنے عقیدہ کی ترویج واشاعت پر اسلام کے مقابلہ میں زیادہ صرف کیا ہے، اس سے دنیا کے مختلف علاقوں میں بہائیت مقبول ہے۔

بہائیوں کو عصر حاضر میں غیر اسلامی فرقہ یا مذہب کی حیثیت حاصل ہے۔ ان کے ادارے تمام دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں، اپنے عقاید وافکار کی اشاعت میں منہمک ہیں۔ اب ان کا مذہبی مرکز ایران سے اسرائیل منتقل ہوگیا ہے۔ جو حیفہ میں قائم ہے اور جسے بین الاقوامی مرکز انصاف (Seatof Universal House of Justice) کہا جاتا ہے۔

احمدیہ یا قادیانی:

اس فرقہ کے احمدیہ کہلانے کا سبب یہ ہے کہ اس کے بانی مرزا غلام احمد (۱۸۳۹ء-۱۹۰۸ء) تھے اور اس فرقہ کے قادیانی کہلانے کا سبب یہ ہے کہ اس کی بنیاد ہندوستانی صوبہ پنجاب کے قصبہ قادیان میں پڑی۔ مرزا غلام احمد قادیانی نے ۱۳۰۷ھ

۱۸۸۹ء میں مہدی موعود ہونے کا دعویٰ کیا۔ مہدی موعود سے متعلق اسلامی عقاید وافکار کا ذکر گذشتہ صفحات میں کیا جا چکا ہے لیکن مرزا غلام احمد نے مہدی موعود کا مختلف تصور پیش کیا۔ انھوں نے دعویٰ کیا کہ وہ مسلمانوں کے مہدی موعود ہونے کے پہلو بہ پہلو عیسائیوں کے یشوع مسیح ہیں، ہندو دیوتا کرشن کے اوتار ہیں اور پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ کا 'بروز' (Reappearance) ہیں۔ مرزا غلام احمد کی وفات کے بعد مولوی نور الدین (م: ۱۳۳۳ھ/ ۱۹۱۴ء) خلیفہ منتخب ہوئے۔ ان کی وفات کے بعد فرقہ احمدیہ میں انشعاب ہوگیا۔ قدیم قادیانیوں نے مرزا غلام احمد کو نبی مان لیا اور ان کے بیٹے مرزا بشیر الدین کو خلیفہ ثانی قرار دیدیا۔ لیکن فرقہ احمدیہ کے لاہوری پیروؤں نے مرزا غلام احمد کو نبی ماننے سے انکار کردیا اور محض مجدد کی حیثیت سے قبول کیا۔ تصور مجددیت اہل تسنن میں مقبول رہا ہے۔ جس کے دعویدار بھی دعویٰ مہدیت کی طرح استحقاق قائم کرتے رہے ہیں۔ فرقہ احمدیہ کے پیرو ہندوستان، پاکستان، مغربی افریقہ، یورپ اور خاص طور پر برطانیہ میں ملتے ہیں۔ ہندوستان میں قادیان اور پاکستان میں لاہور ان کے مراکز ہیں۔ قادیانی مالی واقتصادی اور سماجی معیاروں پر انتہائی منظم جماعت ہے۔

فرقہ احمدیہ یا قادیانی ان کو اصل اسلام کا نمائندہ قرار دیتے ہیں۔ لیکن ان کے عقاید وافکار دیگر اسلامی فرقوں سے مختلف ہیں۔ اصول دین کے معاملات میں سب سے زیادہ اختلاف مسئلہ رسالت کا ہے۔ ہر فرقہ کا مسلمان پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰؐ کو خاتم النبیین مانتا ہے جن کے بعد کوئی دوسرا نبی نہ ہوگا اور قرآن الحکیم سے استدلال کرتا ہے:

ملکان محمد ابا احد من رجالکم ولکن رسول اللّٰہ وخاتم النبیین۔

(محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں لیکن، وہ اللہ کے رسول اور سلسلہ انبیاء کے خاتم ہیں: الاحزاب ۳۳/ ۴۰) لیکن قادیانی تاویل کرتے ہیں کہ خاتم کے معنی آخری کے نہیں بلکہ مہر کے ہیں۔ اور مرزا غلام احمد کو پیغمبر قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی تجسیم کا عقیدہ ہے جس میں وہ کبھی عیسیٰ کبھی کرشن اور کبھی محمد کا پیکر اختیار کرتا رہا وغیرہ جو

اسلامی اصول دین سے انحراف ہے۔ اسی بنا پر قادیانیوں کو دائرہ اسلام سے باہر کردیا گیا۔ البتہ مجدد دین کی حیثیت سے مرزا غلام احمد قادیانی کو قبول کرنے میں بعض اسلامی فرقے تامل نہ کرتے اور نہ کیا۔ قادیانیوں کے بعض دیگر عقاید جو تمام مسلم فرقوں کے متفقہ عقاید سے میل نہیں کھاتے، ان میں خاص طور پر حضرت عیسیٰ سے متعلق عقیدہ کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ تمام مسلمانوں کے برعکس قادیانیوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ نے موت کا بہانہ کیا، دوبارہ قبر سے اٹھے اور ہندوستان ہجرت کرگئے، جہاں ۱۲۰ سال کی عمر میں وفات ہوئی۔ جہاد کے متعلق بھی ان کے مخصوص عقاید ہے۔ لاہوری احمدیہ اسلامی فرقوں سے زیادہ قریب ہیں۔ ان کی قرابتیں بھی اسلامی فرقوں میں ہیں۔

مذکورہ فرقوں کے عقاید کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو فرقہ مہدویہ کے اسلامی فرقہ ہونے میں کلام نہیں ہوسکتا۔ ان کے فقہی عقاید اہل تسنن کے مماثل ہیں۔ احمدیہ کا لاہوری مسلک جو غلام احمد قادیانی کو مجدد مانتا ہے، اس کو بھی اہل تسنن کے مسالک میں شمار کیا جاسکتا ہے لیکن باقی تینوں فرقے مبیضہ روشنیہ اور بہائی ابتدا میں اسلامی فرقے رہے اور امام مہدی موعود کے متعلق مخصوص عقاید وافکار کے حامل رہے۔ یہی صورت حال مرزا غلام احمد کے ان پیروؤں کی تھی، جن کا مرکز قادیان قرار پایا کہ ابتداً امام مہدی موعود کے متعلق مخصوص عقاید وافکار کے پابند رہے لیکن بعد کے ادوار میں انھوں نے نبوت کا دعویٰ کردیا، بلکہ بعضوں نے خود کو ہندوؤں کی طرح خدا کا ظہور قرار دیا، اس لیے ان کو اسلامی فرقوں کی حیثیت سے قبول نہیں کیا جاتا۔ ہم نے ان کا ذکر اسلامی فرقوں میں محض اس خیال سے کیا ہے کہ انھوں نے اپنا سفر اسلام سے شروع کیا اور تاریخ اسلام کے طالب علم کو ان کے بارے میں جاننا چاہیے۔

دیگر فرقے:

اسلامی فرقوں میں کئی ایسے فرقے ہیں، جو مذہبی وعلمی اور سیاسی وسماجی اسباب کی بنا پر تاریخ اسلام کے مخصوص ادوار میں اہمیت کے حامل رہے۔ انھوں نے عقاید وافکار میں انقلاب

بمپا کیا لیکن بعد میں معدوم ہو گئے۔ زیادہ تر کسی نہ کسی اسلامی فرقے میں شامل ہو گئے۔ آخر کار دو بڑے فرقے ہی رہ گئے۔ اہل تشیع اور اہل تسنن۔ ذیل میں جن فرقوں کا ذکر کیا جائے گا، ان میں کسی کو مکمل طور پر اہل تشیع یا اہل تسنن کے عقاید وافکار کی بنیاد پر کسی ایک فرقہ کا مسلک قرار دینا مناسب نہ ہوگا اور نہ ممکن۔ پھر بھی ان کے اساسی عقیدہ کی روشنی میں انھیں موجودہ فرقوں میں کسی کے قریب رکھا جا سکتا ہے، اس کی نشان دہی کی کوشش کی جائے گی تاکہ ہمارے قارئین صحیح طور پر ان فرقوں سے واقف ہو سکیں۔

الخوارج:

خوارج (ماخذ خارجی) نام پڑنے کی وجہ یہ ہوئی کہ اس گروہ نے ابتدا میں حضرت علی کا ساتھ دیا پھر انھیں چھوڑ کر چلا گیا۔ خرجوا علیہ اس گروہ کے کئی اور نام ہیں مثلاً خروریہ کیونکہ یہ لوگ شروع میں ایک جگہ جس کا نام خروراء ہے وہاں چلے گئے تھے۔ محکمہ یعنی یہ لوگ تحکیم پر زور دیتے تھے اور قرآن کی اس آیت سے استدلال کرتے تھے۔ ان الحکم الا اللہ (حکم کرنے کا حق اللہ کو ہے: الانعام ۶/ ۵۷ یوسف ۱۲/ ۴۰) اپنے بانیوں کے نام کے اعتبار سے نافع بن الازرق کے پیرو الازارقہ زیاد بن الاصفر کے پیرو، الصفریہ، عبد اللہ بن اباض کے پیرو والاباضیہ، ابو بیہس کے پیرو، البیہسیہ قبیلہ حنیفہ کے نجدہ بن عامر کے پیرو، النجدیہ، اور عبد الکریم بن العجرد کے پیرو العجاردہ کہے جاتے تھے۔ خوارج کو اولاً حضرت علی کا ساتھ دینے کی بنا پر بعضوں نے انھیں شیعیان علی میں بیان کر دیا، جو صریحی طور پر غلط ہے کیونکہ خوارج خلافت کے لئے مسلمانوں کے آزادانہ انتخاب کو لازمی قرار دیتے، اس کا قریشی ہونا ضروری مانتے اور اولین دو خلافتوں کو حق مانتے تھے۔ یہ تمام عقاید اہل تسنن کے ہیں۔ نیز اہل تشیع ان میں سے کوئی عقیدہ نہیں رکھتے۔ اس لیے صحیح طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ خوارج ابتدا ان مسلمانوں میں تھے جو خلافت راشدہ میں عقیدہ رکھتے تھے اور حضرت علی کی خلافت قائم ہونے پر جمہور اسلام کی طرح انھوں نے بیعت کی لیکن بعد میں حضرت علی سے غیر مطمئن ہو کر باغی

ہوگئے۔ خوارج گناہ کو کفر کا ہم معنی قرار دیتے تھے۔ کسی غیر اللہ کو حکم بنانا گناہ ہے چونکہ حضرت علی نے جنگ صفین میں حکم کے اصول کو قبول کیا، اس لیے معاویہ بن ابوسفیان کی طرح وہ بھی گناہ گار ہوئے اور واجب القتل ہوئے۔

خوارج کی بڑی تعداد معرکہ نہروان میں (۳۸ھ ۶۵۸ء) میں حضرت علی کے ہاتھوں قتل ہوئی لیکن بعد کے ادوار میں بھی حکومتوں کے خلاف خروج کرتے رہے۔ ایک مدت تک انھوں نے قتل و غارت کا بازار گرم رکھا لیکن عباسی دور میں ان کی قوت کا خاتمہ ہوگیا۔ خوارج کو فاسد العقیدہ سمجھا گیا لیکن ان کو دائرہ اسلام کے باہر نہیں قرار دیا گیا، کیونکہ وہ اسلام کی اساسی عقاید کا انکار نہیں کرتے تھے بلکہ حکم خدا بجالانے کی تعلیم میں غلو و افراط کرتے تھے ان کا اکثریتی گروہ الازراقہ اپنے علاوہ تمام مسلمانوں کو مشرک قرار دیتا لیکن اقلیتی گروہ الاباضیہ عام مسلمانوں کو کہتا لیکن مشرک کہنے سے اجتناب کرتا۔ عباسی دور میں خوارج کا خاتمہ ہوا تو مسلمانوں کے اکثریتی دھارے میں شامل ہوگئے جو حکومت وقت کا ہم نوا تھا۔

المرجعہ:

ارجاء یعنی ملتوی کرنا۔ اس فرقہ کے وجود میں آنے کا سبب الخوارج کے اس عقیدہ کا ردعمل تھا کہ جو شخص گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوا، کافر و جہنمی ہوا۔ المرجعہ کہتا تھا کہ اس دنیا میں کسی گنہگار کے متعلق ایسا دوٹوک فیصلہ ملتوی رکھنا چاہیے۔ اس عقیدہ کے صریحی سیاسی مضمرات واضح ہیں جس میں عقیدہ کے طور پر جواب دہی یعنی حکومت وقت (خلفائے بنی امیہ) کے خلاف اظہار رائے بھی ممکن نہیں ہوسکتی چہ جائیکہ ان کے خلاف خروج کیا جائے۔ اصولی طور پر دیکھا جائے تو اس عقیدہ کے مطابق کبائر الاثم کے ارتکاب کے متعلق فیصلے ملتوی رکھنے کی بنا پر حکومت وقت اور اس کے عملہ و کارکنان کو کھلی چھوٹ مل گئی۔ خواہ ان کے اعمال اسلام کی بنیادیں منہدم کرتے ہوں، خاموش تائید حاصل کرلیں گے اور وہی اعمال وقت گذرنے پر اسلام کی روایت کا حصہ بن جائیں گے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ فرقہ محض الخوارج کے خلاف

نہیں تھا بلکہ بنی امیہ کا حکمت عملی سے تائید کرتا تھا جس کی سرپرستی فطری طور پر حاصل ہوئی۔ ان کے عقیدہ ارجاء اہل تسنن کے اساسی عقیدہ وایمان سے اس معنوں میں ہم آہنگ ہے کہ ملتوی کرنے کا یہ عمل بالارکان سے متعلق ہے یعنی احکام الٰہی سے عملی متابقت، جو اہل تسنن کے نزدیک مومن ہونے سے خارج نہیں کرتا اور یہ ان کا مسلمہ عقیدہ ہے جس پر گذشتہ صفحات میں بحث کی جاچکی ہے۔ مرجئہ نے اس انداز فکر کو آگے بڑھا کر کہا کہ شرک سے کم تر تمام برے اعمال لامحال بخش دیے جائیں گے۔ ۸ ان میں بعضوں نے اور آگے بڑھ کر کہا کہ کوئی شخص دار السلام میں بھی، جان کے خوف کے بغیر بھی اگر زبان سے اعلان کفر کرے، بت پوجے، یہودیت یا نصرانیت اختیار کرے، کامل الایمان، اللہ کا ولی اور جنتی ہے۔ ۹ ان خیالات نے معاصی الفسق وفجور کی زبردست ہمت افزائی کی اور اس عقیدہ کی بناپر کہ ثر الاثم میں مبتلا خلفائے وقت کے خلاف آوازیں نہیں اٹھائی جاسکتی، ظلم وستم بے محابہ ہوگئے۔ انھوں نے کہا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے ہتھیار اٹھانے کو فتنہ قرار دیا۔ حکومت وقت کی کسی صورت میں مخالفت نہیں کی جاسکتی، البتہ حکومت سے باہر لوگوں کے برے افعال پر ٹوکنا جائز ہے۔ ۱۰

بنی امیہ کی سیاسی حکمت عملی کے تحت وجود حاصل کرنے والے المرجئہ نے اپنے نظریات سے ظالموں کے ہاتھ مضبوط کیے اور بدی وگناہ کے مقابلہ میں اسلام کی قوت مدافعت کو سخت نقصان پہنچایا۔ لیکن اموی حکومت میں آزادی فکر وخیال کی گنجائش نہیں ہوسکتی تھی، اس لیے المرجئہ میں جب غیلان الدمشقی نے مسئلہ قدر پر زور دیا کہ انسان اپنے ارادے میں آزاد ہے تو خلیفہ ہشام (م: ۱۲۶ھ/ ۷۴۳) نے اس کو قتل کرادیا کیونکہ اس نظریہ سے ظالم حکمراں کو مسند اقتدار سے اتار پھینکنے کا اختیار حاصل ہوتا تھا۔ اس کے برعکس المرجئہ کا دوسرا گروہ تھا الجہمیہ کہلاتا تھا اور جاکابانی جہم بن صفوان تھا، انکار کرتا تھا کہ انسان اپنے ارادے میں آزاد ہے بلکہ اسکے تمام اعمال اللہ تعالیٰ کی جانب سے مقرر ہیں۔ اس طرح عمل بالارکان کی ذمہ

داری سے بری ہے جہم کی موت ۱۲۸ھ/ ۷۴۶ء میں ہوئی لیکن اس کا نظریہ تقریباً سو سال کے بعد اہل تسنن کے عقاید کا حصہ بنا۔

المعتزلہ:

''اعتزال'' معنی علاحدگی، اس فرقہ کا بانی واصل بن عطا (م: ۱۳۱ھ/ ۷۴۸ء) تھا جو خواجہ حسن بصری کا شاگرد تھا۔ روایت ہے کہ گناہ کے ارتکاب کے مسئلہ پر اس نے اختلاف کیا تو خواجہ حسن بصری نے فرمایا۔ اعتزال عنا! ۔ اسی پر نام پڑ گیا۔ ۱۱ لیکن یہ محض اتفاق ہوسکتا ہے۔ المعتزلہ کا ربانی عمر بن عبید ۔ ۷۶۲ء) تھا، جس کے متعلق اس طرح کی کوئی روایت نہیں ملتی۔ ۱۲ حقیقت یہ ہے کہ فرقہ معتزلہ عصری سیاسی محرکات کے نتیجہ میں وجود میں آیا جو حکومت بنی امیہ کا آخری دور تھا۔ مسلم عوام میں حکومت کے خلاف عام بیزاری تھی، سیاسی بغاوتوں کا زور تھا۔ دینی عقاید وافکار کے معیاروں پر المرجئہ کے نظریات کی مقبولیت کم ہوگئی تھی، بعض المرجئہ بھی کھلے عام مخالفت کررہے تھے۔ اس لئے سیاسی جبر کا تقاضہ تھا کہ دینی عقاید وافکار کے معیاروں پر ان تمام عناصر کو یکجا کیا جائے تو بنی امیہ کی مخالفت میں متفق الرائے ہوں۔ ظاہر ہے کہ اس میں اہل تشیع کے آگے ہوسکتے تھے، ایسا ہوا بھی، دوسرے صوفیہ تھے جن کے حلقہ تلامذہ سے المعتزلہ ابھرے، باقی دیگر مسلمان بھی ہم نوا ہوگئے۔ اس لیے المعتزلہ میں مختلف عقاید افراد وعلام نظر آتے ہیں۔ ان کے افکار وعقاید میں بھی تنوع ہے لیکن ان میں اکثریت اہل تشیع کی ہے، جو اپنے مخصوص عقاید کے ساتھ نمودار نظر آتے ہیں۔ مثلاً مسئلہ خلق قرآن پر زور دینے کے بعد انھوں نے مسئلہ ذات وصفات الٰہی پر خالص شیعی زاویہ نظر ع سے بحث کی۔ ۱۳

المعتزلہ کے دینی افکار کے ارتقاء میں اہم ترین حصہ ابو الہدیل العلاف البصری کا ہے، جو اہل تشیع میں سے تھا۔ ۱۴ اس سے عمر میں کچھ بڑا اہم عنصر بشر بن المعتمر البغدادی اور عمر میں کچھ چھوٹا ابراہیم النظام تھا۔ المعتزلہ کے دو مختلف دبستان تھے، جو دبستان بصرہ اور دبستان

بغداد تھا۔ ان دونوں کے مکتب فکر الگ الگ تھے۔ دبستان بصرہ کے رئیس (ابوعلی) الجبائی کے دو شاگرد نمایاں ہوئے۔ اس کا بیٹا ابوہاشم (م: ۳۲۱ھ/ ۹۳۳) اور شاگرد ابوالحسن الاشعری، جس نے المعتزلہ سے علاحدگی اختیار کر کے الگ راسخ العقیدہ مکتب فکر کی بنیاد رکھی جو 'الاشاعرہ' کہے جاتے ہیں۔ امام احمد بن حنبل اور دیگر راسخ العقیدہ اہل تسنن بھی المعتزلہ کے شدید مخالف ہوئے۔ لیکن ان مخالفتوں سے المعتزلہ کی اہمیت کم نہیں کی جاسکتی، بلکہ یہی انکی شہرت کے اسباب ہیں۔ المعتزلہ کی اصل اہمیت کئی انواع کے منطقی اور مابعد الطبیعاتی غوروفکر کی بنا پر ہے۔ انہوں نے یونانی فلسفے کی تحصیل اور اس کے بعض فکری دبستانوں کی اسلامی عقاید وافکار سے تطبیق کی۔ انھوں نے غیر مسلموں کے مقابلہ میں اسلامی عقاید کی مدلل عقلی مدافعت کی۔ انھوں نے غیر مسلم مفکرین کے ساتھ کئی مسائل ومباحث پر مناظرے کئے جن کے تحریری ثبوت موجود ہیں۔ انھوں نے علم کلام کی توسیع کی۔

المعتزلہ، دینی عقاید کے اظہار میں عجیب وغریب رویہ رکھتے، جن کا صحیح تناظر میں تجزیہ کیے بغیر حقائق تک رسائی ممکن نہیں ہوسکتی۔ جن میں کلیدی نکتہ اہل تسنن کے مسلمہ عقاید وافکار کے خلاف ردعمل ہے مثلاً المعتزلہ حدیث واجماع کو ساقط قرار دیتے۔ ۱۵ فاسق وفاجر کو امام ماننے سے انکار کرتے۔ ۱۶ اس کے تحت جمعہ ونماز کو جائز نہیں قرار دیتے۔ ۱۷ فتنہ واختلاف کی صورت میں تقرر خلیفہ کے خلاف تھے۔ ۱۸ خلیفہ کے لیے قریشی ہونے کی شرط قبول کرتے ۱۹ بلکہ اس کا عجمی ہونا بہتر مانتے، بلکہ آزاد کردہ غلام کو خلیفہ بنانا اس سے بھی اچھا مانتے کیونکہ خلیفہ کے غیر عادل ہونے یا ظلم وستم کرنے کی صورت میں معزول کرنا زیادہ آسان ہوگا۔ ۲۰ یہ بھی کہتے کہ خلیفہ کا تقرر ضروری ہے، پھر کہتے کہ فضول ہے، امامت کو عدل پر قائم ہونا چاہیے۔ ۲۱ غرضیکہ المعتزلہ نے غلط مبحث کر کے اہل تسنن کے اس اساسی عقیدہ میں پیچیدگی پیدا کردی۔ خلافت راشدہ کے واقعات پر ان کے فیصلے بڑے جارحانہ تھے۔ جنگ جمل اور جنگ صفین میں کسی ایک فریق کے فاسق ہونے کا اعلان کرتے، لیکن اس کی نشان دہی نہ

کرتے۔ ۴۲؎ البتہ حضرت عثمان پر سخت تنقید کرتے، حتیٰ کہ حضرت عمر کو بھی مطعون کرنے سے باز نہ آتے۔ ۴۳؎ اہل تشیع کے عقاید وافکار سے کئی منزلوں میں ہم آہنگ تھے۔ جبر وقدر کو اساسی عقیدہ قرار دیتے، جو شیعی عقاید میں شامل ہے۔ کفر وایمان کے معاملہ میں شیعوں کا عقیدہ رکھتے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ گناہگار مسلمان نہ مومن ہے، نہ کافر بلکہ بیچ کی حالت میں ہے۔ ۴۴؎ اسی طرح امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے معاملہ میں ظالم وفاسق کے خلاف خروج میں عقیدہ رکھتے تھے۔ ۴۵؎

المعتزلہ دور عباسی میں ہی خاتمہ ہوگیا ان کے متنوع عقاید نے اپنے اپنے پسندیدہ عقایدی گروہوں میں مدغم ہونے میں مدد کی۔ الاشاعرہ نے فکری دبستان کی حیثیت سے المعتزلہ کی جگہ لے لی لیکن المعتزلہ نے عقلی وفکری معیاروں پر تجزیہ وتفہیم کی روایت عطا کرکے اسلامی دینی عقاید کو نئے ابعاد سے روشناس کیا تھا، جس کی روشنی ہر دور میں باقی رہے گی۔

زندقہ:

زندق بمعنی (To profess dualism) اصطلاحاً خلافت عباسی میں عجمی قوم پرستی کی تحریک شعوبیت کے معتقدات، جو اموی حکومت کے ذریعہ عربوں میں نسلی، قبائلی اور وطنی عصبیتوں کے ردعمل میں وجود میں آئے۔ ابتدا میں شعوبی تحریک کا نعرہ تھا کہ عربوں کو عجمیوں پر کوئی فضیلت نہیں ہوسکتی لیکن بعد میں اس نے عربی کی مخالفت کا رنگ لے لیا۔ عربوں کی مذمت میں کتابیں لکھی گئیں۔ قریش ودیگر قبائل کی مذمت میں کئی کتابوں کا ذکر ابن الندیم کی فہرست میں ملتا ہے۔ زندقہ اسی کا نام ہے۔ مخالفین الزام وارد کرتے کہ عجمیوں نے دلوں میں ان کے قدیم مذہب وعقاید زندہ ہیں، جس کے نتیجہ میں وہ وحدت کی بجائے ثنویت، کے قائل ہیں۔ وہ اپنے ہمراہ الحاد واباحیت کے جراثیم لائے، جس کو جسم اسلام میں داخل کیا۔ ۴۶؎ ان لزامات کو شعوبیوں نے کبھی قبول نہیں کیا۔ ان کے علاحدہ گروہ ہونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا خواہ خود کوئی نام دیں۔ عباسی خلیفہ منصور (م:۷۷۵ء) کے دور تک یہ لوگ مملکت اسلامی پر حاوی

ہوگئے۔ جس سے خلافت عباسی کو خطرہ محسوس ہونے لگا۔ خلیفہ المہدی (م: ۷۸۵ء) نے گھبرا کر طاقت کے استعمال سے ان کا زور توڑنے کی کوشش کی۔ اس نے علماء کو مامور کیا کہ ان لوگوں سے بحثیں اور ان کے رد میں کتابیں لکھیں۔ اس نے ایک مستقل محکمہ عمر الکلاذی قائم کیا جس کا کام ان کے استیصال اور سرکوبی تھا۔ اس طرح اثرات کے تحت منظم گروہ کا نام زندقیہ ہوگیا۔ ہنوز یہ نام انھیں معنوں میں عرب اپنے مخالفین خصوصاً اہل ایران کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

شعوبی تحریک کو زنادقہ کی جماعت قرار دینے کے سیاسی مضمرات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ابو العلاء المعری اس عہد کے تمام نامور عجمیوں کو زنادقہ میں شمار کرتا ہے مثلاً دعبل، بشار بن برد، ابو نواس ابو مسلم خراسانی وغیرہ ۲۷ ان کے عقاید کا ذکر سب وشتم سے ہوتا۔ ابن عبدربہ کہتا ہے کہ شراب، زنا اور رشوت زندقی کے لوازمات و علامات ہیں۔ ۲۸ بھلا ان لوازمات وعلامات کو کون ذی ہوش تسلیم کرے گا لیکن قدیم سے ابتک بعض اپنے مخالفین کو اسی طرح کی گالیوں سے نوازتے رہتے ہیں جس سے ان کے بیان کی حیثیت کم ہوجاتی ہے علامہ اقبال لکھتے ہیں: ''(زنادقہ) میں میرے خیال کے مطابق اپنے مخالفین کی بہ نسبت زیادہ استواری اور توافق تھا، اس بات کے حامی تھے کہ ابتدائی ارواح ایک دوسرے سے علاحدہ اور مستقل وجود رکھتی ہیں۔ اس کے برعکس مجوسی ان ارواح کی وحدت کے قائل تھے۔ وحدت کے علم برداروں نے زنادقہ سے مقابلہ کرنے کی مختلف طریقوں سے کوشش کی لیکن یہ واقعہ کہ وہ ابتدائی توام ارواح کی وحدت کا ظاہر کرنے کے لئے مختلف فقروں اور تعبیرات سے کام لیتے تھے، اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ ان کے مخالفین کی کیا قوت تھی اور یہ کہ وہ خود اپنی فلسفیانہ توجیہات سے مطمئن نہ تھے۔''۲۹

قرامطہ:

اس فرقہ کا نام موجد کے لقب قرمطہ سے ہوا، جس کا نام حمدان تھا۔ جو اپنے زہد وتقویٰ میں مشہور تھا۔ روایت ہے کہ بیل پر سواری کرتا تھا، عوام میں کرمیتہ کہلاتا تھا، جس کا

معروف قرمطہ ہوا۔ اس کو ایک اسماعلیہ داعی نے ۲۶۴ھ ۸۷۷ میں اپنے مسلک میں داخل کیا۔ حمدان میں بے پناہ انتظامی صلاحیتیں تھیں ۔ ابتداً اسماعیلیہ عقاید کی تبلیغ واشاعت شروع کی جو بڑھ کر طاقتور سیاسی تحریک بن گئی اور اس میں شامل افراد قرامطہ کہے جانے لگے۔ حمدان کے برادر نسبتی لبادان نے کوفہ کے نواح میں خفیہ طور پر تحریک چلائی ۔ ۲۸۶ھ ۸۹۹ء میں خروج کیا اور یمین پر قبضہ کرلیا۔ وہاں سے اسماعیلیہ داعی شمالی افریقہ پہنچے ، جہاں سے فاطمی تحریک ابھری ، مصر فتح ہوا اور عباسی حکومت کی حریف حکومت قائم ہوئی اور عباسیوں کے لئے مسلسل خطرہ بنے رہے۔ اس طرح واضح ہے کہ قرامطہ ابتداً اسماعیلیہ مسلک کی ایک ضمنی شاخ تھے لیکن بعد میں انھوں نے الگ فرقہ کی حیثیت سے شہرت حاصل کی ۔ ۷؎

قرامطہ نے شمالی مشرقی عرب میں الحد میں اپنی حکومت قائم کی۔ انہوں نے ۹۰۶۔ ۹۰۳ء میں شام اور عراق پر حملے کیے۔ قرامطی رہنما ابو سعید الحسن الجنابی نے بحرین کو مرکز بنایا۔ اس کے بیٹے اور جانشین ابو طاہر سلیمان قرمطی نے ۹۲۳ء میں بصرہ فتح کرلیا۔ ۹۲۹ء میں قرامطہ کی ایک بڑی جماعت مکہ مکرمہ گئی ۔ حاجیوں کا قتل عام کیا۔ غلاف خانہ کعبہ لوٹ لیا ، خانہ کعبہ کا دروازہ اکھاڑ پھینکا اور حجر الاسود کو نکال کر اپنے ہمراہ یمن لے گئے ، بائیس برس تک اس سنگ بہشتی کو اپنے قبضہ میں رکھا ، حتیٰ کہ مصر کے فاطمین کی مداخلت کے بعد واپس کیا۔ قرامطہ اپنے مخالفین کا قتل عام ان کا مال ودولت اور خون مباح جانتے تھے۔ ان کے دفاع میں کہا جاسکتا ہے کہ ان کے افعال خلافت بنی امیہ اور ان کے بعد خلافت عباسیہ میں اسماعیلیوں کے مسلسل قتل عام اور بہیمانہ مظالم کے ردعمل میں ہوا لیکن انھوں نے حاجیوں اور دیگر بے قصور مسلمانوں کا قتل عام کیوں کیا؟ خانہ کعبہ کی بے حرمتی کیا کھلا خانہ کعبہ کی بے حرمتی کیا کھلا ہوا الحاد وکفر نہیں ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ قرامطہ نے اپنا سفر اسماعیلیت کیا تھا لیکن بعد اس کے حدود سے کوسوں دور تجاوز کرگئے اور کفروالحاد کی راہ اختیار کرلی۔ قرامطہ کے عقاید وافکار ، دائرہ اسلام سے باہر ہوگئے ۔ مثلاً نماز ، روزہ اور حج کی مخالفت ، جنسی آزادی ، شراب

نوشی کی اجازت وغیرہ۔ البتہ مہدویوں کی طرح عشر (دسواں حصہ) کے قائل تھے۔ اور اہل تسنن کی طرح شوریٰ کے پابند تھے۔ بحرین میں مجلس شوریٰ قائم تھی، جو قرامطہ کے تمام مسائل ومباحث کی نگراں ورہنما تھی۔ ۱۴؎ قرامطہ کی حکومت ۳۶۶ھ/ ۹۷۷ تک قائم رہی جس کے پانچ حکمراں یکے بعد دیگرے ہوئے، بعدہٗ زوال ہوگیا۔

الباطنیہ:

اس فرقہ کا نام ایک مخصوص عقیدہ کی بنا پر ہے کہ حکم ظاہر کا باطن بھی ہوتا ہے، جو عام لوگوں کی نظر سے مخفی رہتا ہے۔ حکم ظاہری وباطنی کی اس فلسفیانہ توجیہ سے شریعت اسلامی کے اصول وضوابط پر جس انداز میں شہ پڑتی ہے، اس کا اندازہ اہل نظر کرسکتے ہیں۔ اس فلسفیانہ توجیہ کا موسس حسن بن صباح تھا، جو انتہائی الوالعزم شخصیت کا مالک تھا۔ نظام الملک طوسی کا ہم جماعت رہ چکا تھا۔ اسماعیلیہ عقاید کا پرزور مبلغ تھا۔ نزاری مسلک پر تھا۔ بنوامیہ اور بنی عباس کی حکومت میں اسماعیلیوں پر مظالم، قتل عام اور بہیمانہ حرکتوں نے دل ودماغ میں نفرت وانتقام کی آگ دہکادی تھی، جو کسی طرح بجھائے نہ بجھی اور اس نے انھیں سکون میں حساب بیباق کیا، جس سے انتہائی متنازعہ فیہ شخصیت بن گیا، لاتعداد غلط سلط باتیں منسوب ہوگئیں۔ حسن صباح کو خلفائے فاطمیین کی سرپرستی حاصل تھی۔ اس نے رفتہ رفتہ اپنی قوت بڑھائی ورقزوین کے شمال میں علاقہ رودبار کے قلعۂ الموت پر ۶/ رجب ۴۸۳ھ (۴ نومبر ۱۰۹۰ء) میں قبضہ کرلیا۔ اس تعمیر نو سے ناقابل تسخیر بنادیا۔ اپنی عسکری قوت بڑھا کر رودبار الموت کے نواحی علاقوں پر قبضہ کرلیا، تبلیغ واشاعت کے لئے دور دراز کے علاقوں میں مناسب اقدامات کیے۔ حسن صباح ۳۵ برسوں تک قلعہ الموت پر قابض رہا۔ سلجوقی حکمراں ملک شاہ (م: ۱۰۹۲ء) اس کی بڑھتی ہوئی قوت کے سدباب کی کوشش میں خود ہی ایک فدائی کے ہاتھوں قتل ہوا۔ سلطان سنجر نے بھی ایک بار الموت کا محاصرہ کیا لیکن ناکام رہا۔ حسن صباح نے اپنے بعد کیا بزرگ امید کو جانشین مقرر کیا۔ اس کے بعد محمد بن بزرگ، پھر حسن بن محمد بن کیا بزرگ تخت پر بیٹھا۔ اس نے لامت

کا دعویٰ کیا اور کہا کہ اس میں امامتیں جمع ہوگئی ہیں۔ ۲۷ رمضان کو جشن کیا، روزے تڑوادیئے، تمام دن عیش ونشاط اور شہوت پرستوں میں گذارا۔ ۳۲ اس کے بعد کئی حکمراں ہوئے حتیٰ کہ شوال ۶۵۴ھ/ اکتوبر ۱۲۵۶ء میں تاتاریوں نے قلعہ کا استیصال کیا اور باطنیوں کو صفحۂ ہستی سے مٹادیا۔ ۳۳

الباطنیہ کی ابتدا اسماعیلیہ مسلک سے ہوئی بعد میں انھوں نے اپنے عقاید وافکار کے اعتبار سے قرامطہ کی طرح الگ مسلک بنالیا اور رفتہ رفتہ ایک الگ فرقہ کی حیثیت حاصل کرلی۔ حسن صباح خود کو اسماعیلیوں کا ساتواں امام اسماعیل بتاتا تھا، جنھوں نے دوبارہ ظہور کیا ہے۔ باطنیہ خدا کو معرّیٰ و معطّل مانتے تھے۔ ذات وصفات کے معاملہ میں اسماعیلیہ کے برعکس جو جملہ صفات کو عین ذات مانتے تھے، انھوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ میں کوئی صفت سرے سے ہے ہی نہیں کیونکہ اگر اس میں صفات ہوں تو مخلوق کی طرح ہوجائے گا، جس پر تشبیہ لازم آئے گی۔ اس کی جانب منسوب صفات کا مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وہ صفات مخلوق کو عطا کیں۔ وہ ان معنوں میں قادر نہیں کہ خود قدرت رکھتا ہے بلکہ وہ دوسروں کو قدرت عطا کرتا ہے۔ اس لیے باطنیہ ہر صفت کے ساتھ نفی صیغہ استعمال کرتے۔ اللہ تعالیٰ کو نور کی بجائے لانور اور حی کی بجائے لاحی کہتے۔ ہر حکم ظاہری کے ایک باطن قار دینے کی بناپر ہر قسم کے نصرت کی آزادی حاصل کرلیتے کہ وہ تو ظاہری حکم ہے، باطنی حکم تو دوسرا ہی ہے۔ اس طرح داعی اپنے پیروؤں کو بے تکلیف خلاف شرع احکامات صادر کرتا، جس کو وہ اندیشہ عاقبت کے پیش نظر بخوشی سر انجام دیتے۔ باطنیہ تنظیم کے تین زمرے تھے۔ داعی، رفیق اور فدائی۔ داعی دعوتِ دین کے فرائض انجام دیتا، رفیق داعی کا معین ومددگار ہوتا، فدائی انتہاپسند عسکری تنظیم تھی جو قضائے مبرم کے مانند اٹل تھی۔ فدائیوں کے ہاتھوں تقریباً ڈیڑھ سو برسوں کے دوران اہل تسنن کے لاتعداد فقہا، علماء فضلاء امراء وزراحتیٰ کہ سپہ سالار، سلاطین اور خلفاء بھی قتل ہوئے۔ اس بناپر اہل تسنن میں فرقہ باطنیہ کی سب سے زیادہ مخالفت ہے۔ ۳۴

مذکورہ بالا فرقوں او مسلکوں کی انفرادی خصوصیات ہیں، جن کا اجمالی تعارف گذشتہ صفحات میں پیش کیا گیا لیکن ان کے متعلق زیادہ تر مستشرقین اور بعض ہندوستانی مسلمان مصنفین کا عجیب وغریب رویہ رہتا ہے جو سب کو ایک ساتھ ملاحدہ، زنادقہ، قرامطہ، باطنیہ (اور کبھی کبھی شیعہ بھی) کہہ دیتے ہیں۔ گویا وہ ان سب کو ایک ہی قرار دیتے ہیں۔

❁❁❁❁❁

حوالے:

۱۔ابن خلدون: مقدمہ ص ۳۸۴

۲۔ابو یوسف: کتاب الخراج ص ۱۱۶۔۱۰۸

۳۔سعید اکبر آبادی، مسلمانوں کا عروج وزوال ۴۰ (دہلی ۱۹۴۷ء)

۴۔ابن ماجہ ص ۳۶۷ الترمذی ج وص ۳۶، ابن مادود (ج ۲ ص ۴۲۲)

۵۔الترمذی ج ۲ ص ۳۶، ابو داؤد ج ۲ ص ۴۲۰

۶۔الترمذی ج ۲ ص ۳۶، ابو داؤد، ج ۱۳ ص ۱۷۸، مجلسی بحار الانوار ج ۱۳ ص ۱۵۹

۷۔ابن ماجہ ص ۳۶۷، اردبیلی۔کشف الغمہ ج ۳ ص ۶۳۔۳۶۲

۸۔الترمذی: ج ۲ ص ۶۳، ابن بولہ: ص ۲۳۔اور ۵۲۵

۹۔الترمذی ج ۲ ص ۳۷، المفید: الارشاد ص ۳۶۳

۱۰۔قزوینی: آثار البلاد

۱۱۔ابن الاثیر: تاریخ الکامل

۱۲۔البیرونی: الآثار الباقیہ

۱۳۔عوفی: جوامع الحکایات

۱۴۔سیدولی سکندر آبادی: سوانح مہدی موعود ج ۱ ص ۴۷۔اور ۶ (حیدر آباد ۱۹۳۱ء)

۱۵۔سیدولی سکندر آبادی: سوانح مہدی موعود ج ۱ ص ۴۷۔اور ۶ (حیدر آباد ۱۹۳۱ء)

۱۶۔سید خدا بخش رشدی: بوستان ولایت ص ۲۲۲ (حیدر آباد ۱۹۵۶)

۱۷۔عبدالقادر بدایونی: منتخب التواریخ ص ۱۶۷۔اور ۲۱۶ (ترجمہ محمود احمد فاروقی)

۱۸۔عبدالقادر بدایونی: منتخب التواریخ ص ۲۷۔اور ۲۳ (ترجمہ محمود احمد فاروقی)

۱۹۔Encyclopaedia Bri Fannica Micropaedia Vol 1p 797

۲۰۔خلافت وملوکیت ص ۱۹۹

۲۱۔عبد القاہر بغدادی: الفرق بین الفرق ص ۱۷۔ ۵۵۔ ۸۳۔ ۸۲، ۱۹۹۹، ۳۱۲۔۳۱۳، الشہرستانی: کتاب الملل والنحل ج ۱ ص ۱۰۰ و ۱۸۷ الاشعری: مقالات الاسلامیین ج ۱ ص ۹۰ و ۱۵۶ (لندن) المسعودی: مروج الذہب ج ۲ ص ۱۹۱

۲۲۔کتاب الملل والنحل۔ ج ۱ ص ۱۰۴

۲۳۔ابن حزم: الفصل فی الملل النحل ج ۴ ص ۲۰۴ (مصر ۱۸۹۹ء)

۲۴۔ابو بکر الجصاص: احکام القرون ج ۲ ص ۴۰

۲۵۔اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج ۱۵ ص ۲۹۹ (لاہور ۱۹۷۵ء)

۲۶۔ایضاً ج ۱۵ ص ۳۰۰

۲۷۔خلافت وملوکیت ص ۲۰۳

۲۸۔محمد اقبال: فلسفہ عجم ص ۵۷

۲۹۔الفرق بین الفرق ص ۳۹۔۱۳۸

۳۰۔الاشعری: مقالات الاسلامیین ج ۲ ص ۱۲۴

۳۱۔الملل والنحل ج ۱ ص ۵۱

۳۲۔مروج الذہب ج ۲ ص ۱۹۱

۳۳۔الملل والنحل ج ۱ ص ۶۳

۳۴۔مروج الذہب ۲ ص ۱۹۱

مولانا سید علی محمد نقوی

قرآن شناسی

تفسیر سورہ البقرہ

تعارف:

البقرہ قرآن کریم کا طویل ترین سورہ ہے جس کا نام اس سورہ کی بعض آیات سے، جس میں ایک گائے کے ذبح کرنے کا واقعہ مذکور ہے، لیا گیا ہے۔ چونکہ اس سورہ میں متعدد مقامات پر اہل یہود کا تذکرہ موجود ہے اور گائے کی پرستش یہودیوں کا ایک مخصوص مشرکانہ عمل تھا اس لئے اس واقعہ کو جائز طور پر زیادہ اہمیت دی گئی ہے اور اسی کے مطابق اس سورہ کو یہ نام دیا گیا ہے۔ یہاں یہ بات ضرور ملحوظ خاطر رہنی چاہیے کہ مختلف سوروں کے نام صرف ان کی شناخت کے لئے رکھے گئے ہیں اور یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر سورے کا اصل موضوع اسی نام کے مطابق ہو۔ سوروں کے یہ نام رسول اکرمؐ نے خود وحی الٰہی کے مطابق معین کیے ہیں۔

یہ سورہ پیغمبرؐ کی مدنی زندگی کے اولین دور میں نازل ہوا۔ اس کا بڑا حصہ ہجرت کے پہلے اور دوسرے سال میں نازل ہوا جبکہ اس کی بعض آیتیں بعد میں اور کچھ وفات پیغمبرؐ کے قریب نازل ہوئیں۔

سورہ بقرہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ جلیل القدر شیعہ مفسر علامہ طبرسی اپنی مشہور تفسیر ''مجمع البیان'' میں لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ پیغمبر اکرمؐ سے سوال کیا گیا کہ قرآن کریم کا کون سا سورہ سب سے بہتر ہے تو آپ نے فرمایا البقرہ۔ پھر سوال کیا گیا کہ (اس کی) کونسی آیت بہتر ہے تو آپ نے ارشاد فرمایا آیۃ الکرسی۔ اس سورہ مبارکہ کی فضیلت دوسرے سوروں پر ظاہری طور سے اولاً اس کی ہمہ گیری اور ثانیاً آیت الکرسی (آیت ۲۵۵) کی وجہ سے ثابت ہے۔ اس

میں اللہ کی توحید اور اس کی معرفت کے مخصوص مضامین پنہاں ہیں جنہیں ہم انشاء اللہ آگے زیر بحث لائیں گے۔ اسی سورہ کی اہمیت کے سلسلے میں امام زین العابدین علی ابن الحسین علیہ السلام سے مروی ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا: جو شخص سورہ بقرہ کی پہلی چار آیتیں، آیت الکرسی اور اس کے بعد کی دو آیتوں کے ساتھ اس سورہ کی آخری تین آیتوں کی تلاوت کرتا ہے تو گویا کہ وہ ہدایت یافتہ اور امان میں ہے۔

تاریخی پس منظر:

پیغمبرؐ کے مدینہ پہنچنے کے بعد اسلامی تحریک اپنے نئے دور میں داخل ہوئی جہاں کے معاملات ومسائل مکی دور سے بہت مختلف تھے۔ مکی دور میں آنحضرتؐ کا بیشتر وقت مسلمانوں کو اسلام کے بنیادی عقائد اور اخلاقیات کی تعلیم وتبلیغ میں صرف ہوتا تھا جبکہ ہجرت کے بعد چونکہ مدینے میں ایک چھوٹی سی اسلامی حکومت قائم ہوگئی تھی اس لئے خداوند عالم کی جانب سے اب سماجی، اقتصادی اور سیاسی امور سے متعلق بنیادی ہدایات کا نزول شروع ہوا۔

ہجرت سے قبل پیغام اسلام کے مخاطبین اکثر اوقات میں کفار مکہ ہوتے تھے۔ ہجرت کرنے کے بعد آپ نے پایا کہ مدینہ اور اس کے اطراف میں یہودیوں کی بہت سی بستیاں آباد ہیں۔ ان اہل یہود کا مذہب رسم ورواج کی خرافات اور وحی الٰہی میں تصرف اور تحریف سے عبارت تھا۔ ان لوگوں نے اور خصوصاً ان کے رہنماؤں نے مذہب کو مادی فوائد کے حصول اور خواہشات نفسانی کی تکمیل کا ایک ذریعہ قرار دے رکھا تھا۔ اسلامی تحریک کے اس دور میں منافقین کا ایک گروہ بھی پیدا ہوگیا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے فتنہ پردازی کی غرض سے کلمہ پڑھ کر اپنا نام مسلمانوں میں درج کروالیا تھا جبکہ ان کے قلوب کفر والحاد کی غلاظتوں سے ملوث تھے۔ ان لوگوں نے خفیہ طور پر کفار سے روابط بڑھا رکھے تھے اور ان کی سازباز سے شجر اسلام کو کھوکھلا بنانے کا منصوبہ بنایا جارہا تھا۔ منافقین کا ایک گروہ ایسا بھی تھا جس نے صرف اسی لئے دائرہ اسلام میں آنا قبول کیا تھا کہ ان کے خاندان کے اکثر افراد مسلمان ہوگئے تھے، یہ لوگ در

اصل اس نئے مذہب کو اپنانے میں متزلزل تھے اور کسی قطعی فیصلے پر ابھی تک نہیں پہنچے تھے۔

سورہ بقرکا موضوع:

اس سورہ کا اصل موضوع اسی سورہ کی ۱۴۰ ویں آیت میں واضح کیا گیا ہے یعنی ''اللہ کی نشانیوں پر غوروفکر'' انتظام نبوت، گزشتہ تہذیبوں کے افسانے، نا قابل تبدیل مشن الٰہیہ وغیرہ اس کی نشانیاں ہیں جن کا ذکر اللہ نے اس سورہ کی متعدد آیات میں بھی اختصار اور کبھی تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ بنیادی طور پر یہ سورہ اہل یہود اور ان کی اسلام دشمنی کے بیان پر مشتمل ہے۔

اس سورہ کی ابتدائی آیات میں اسلام کے بنیادی اصول اور عقائد کا بیان ہے۔ یہ بنیادی عقاید پانچ ہیں۔ ایمان بالغیب یعنی اللہ، حضرت محمد مصطفیٰ ؐ اور انبیائے ماسبق پر نازل ہونے والی کتابوں پر ایمان، اور ایمان بالآخرۃ۔ عقاید کے بعد اعمال کی منزل میں عبادتوں کا ذکر ہے جو اپنے وسیع مفاہیم میں درحقیقت تمام اوصاف حسنہ اور بالخصوص عشق الٰہی اور انسان دوستی کا سرچشمہ ہے۔

سورہ بقرہ اور سورۃ فاتحہ کے درمیان یہ ایک واضح رابطہ ہے۔ جس طرح سورہ فاتحہ کی آخری آیتوں میں بندہ اپنے رب سے صراط مستقیم کی جانب ہدایت کا سوال کرتا ہے اسی کے جواب میں سورہ بقرہ کی ابتدائی آیات اسکی دعا کو قبولیت کا شرف بخشتے ہوئے اعلان کررہی ہیں'' یہ کتاب، جس میں کسی شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں، متقین کے لئے ہدایت ہے'' (آیت ۲)

الف، لام، میم الٓمٓ (۲:۱)

حروف مقطعات کا بیان:

سورہ بقرہ کی ابتداء تین عربی حروف یعنی ا،ل،م سے ہوتی ہے، ان حروف کو حروف

مقطعات کہا جاتا ہے۔ ان حروف کو ہم نے بغیر ترجمہ کے اس لئے چھوڑ دیا ہے کہ ان کا ترجمہ ممکن نہیں ہے۔ انہیں اس طرح الگ الگ حروف کی شکل میں پڑھا جاتا ہے۔ یہ حروف مقطعات قرآن کریم کے اٹھائیس ۲۸ سوروں کی ابتداء میں وارد ہوئے ہیں۔ جن حروف سے ملکر یہ حروف مقطعات بنے ہیں ان کی مجموعی تعداد تیرہ ۱۴ ہے، یہ حروف ہیں: ا،ل،م،ص، ر،ک،ح ،ی،ع، ط،س، ھ اور ق۔ ان میں سے حرف قٓ کسی سورہ کی ابتداء میں اکیلے صرف ایک مرتبہ آیا ہے جبکہ دوسرے حروف دو یا زیادہ مجموعوں میں مختلف سوروں کی ابتداء میں وارد ہوئے ہیں۔ اکیلے ا،ل،م ہی چھ سوروں یعنی اس سورہ کے علاوہ ۲۹،۳، ۳۰، ۳۱ اور ۳۲ ویں سورہ کی شروعات میں آیا ہے۔

ان حروف مقطعات کے بارے میں مفسرین اور محققین نے بہت کچھ لکھا ہے مگر اس میں سے اکثر کی حیثیت تخمینے اور اندازے سے زیادہ نہیں ہے۔ ہمیں ان حروف کو غیبی اور عرفانی اشارات ہی سمجھنا چاہئیے جن کے معنی ان حروف کو نازل کرنے والے خداؐ اور وحی الٰہی کے سرچشموں سے سیراب ہونے والے راسخون فی العلم کے سوا کسی پر ظاہر نہیں ہیں۔

اس سلسلے میں مولانا مودودی کی رائے یہ ہے کہ نزول قرآن کے زمانے میں عربی شعرا اور خطیب اس طرح کے حروف اپنے اپنے کلام میں عمومی طور پر استعمال کرتے تھے اور یہ اس زمانے کا ایک معروف طریقہ تھا۔ عرب ادباء اور عوام ان حروف مقطعات کے معنی اور مفاہیم سے بخوبی واقف تھے اور یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں رسولؐ کے کسی صحابی نے ان حروف کے سلسلے میں کسی شک وشبہ یا اعتراض کا اظہار نہیں کیا اور نہ کسی صحابی رسولؐ نے آنحضرتؐ سے ان حروف کے معنی دریافت کیے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس زمانے کے عربوں کے نزدیک یہ حروف کسی معمہ کی حیثیت نہ رکھتے تھے، پھر ہوا یہ کہ زمانے اور زبان کی تبدیلی کے ساتھ یہ حروف عربی ادب میں متروک ہوتے چلے گئے اور اب لوگوں کے لئے ان کے معنی کا تعین کرنا مشکل ہوگیا۔ ان ابتدائی علاماتی حروف کو سمجھنا ہمارے امکان کے باہر

ہے۔ اس لئے ہمیں اس کی سعی لاحاصل بھی نہیں کرنی چاہیے۔ اس لئے کہ قرآن انسانوں کے لئے کتاب ہدایت ہے اور قرآن سے سچی ہدایت حاصل کرنا حروف کی اس گتھی سلجھانے پر منحصر نہیں ہے۔ اس طرح ایک عام قاری کو اس مسئلے میں زیادہ غوروفکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

بحر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ علامتی اور عرفانی حروف لطف الٰہی کے سرچشمے اور علوم الٰہیہ کے خزانے ہیں۔ انکے حقیقی معنی انوار باطنی کے ذریعے ہی ہم پر منکشف ہوسکتے ہیں اسی لئے صوفیائے کرام اور عرفاء نے ان حروف کی اہمیت پر بہت زور دیا ہے اور اسلامی دعاؤں میں لطف و رحمۃ الٰہی کے وسیلے کے طور پر ان حروف کی بہت تکرار ملتی ہے۔

آیت ۲:۲

قرآن میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔

''یہ کتاب، جس میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے، متقین کے لئے ہدایت ہے''

قرآن کی ماہیت:

اس آیہ کریمہ میں قرآن کو ''الکتاب'' کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ قرآنی اصطلاحات کے مطابق ''کتاب'' یا اسکی جمع ''کتب'' صحیفہ یا مکتوب وحی کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ اس طرح اس لفظ کا استعمال ابتداء ہی میں کرکے یہ بات واضح کردی گئی ہے کہ قرآن از روز اول ایک کتاب ہے کوئی زبانی تعلیم نہیں۔ جبکہ دوسرے مذاہب کی مقدس کتابیں درحقیقت زبانی تعلیمات ہیں جنہیں بعد میں کتابی شکل عطا کی گئی۔ قرآن حکیم کا مختلف مذاہب کے صحیفوں پر یہ بھی ایک امتیاز ہے کہ یہ اپنی ابتداء سے ایک مکتوب صحیفہ ہے جسے کتاب ہی کی شکل میں نازل کیا گیا ہے۔ دوسرے مذاہب کے صحیفے عمومی طور پر مختلف ادوار میں جمع کیے گئے مختلف اقوال ہیں جنہیں بعد میں ایک کتابی شکل میں مرتب کیا گیا۔

قرآن ایک کتاب نہیں بلکہ ''الکتاب'' ہے یعنی کامل ترین کتاب تمام کتابوں میں صرف قرآن ہی وہ عظیم کتاب ہے جو اپنے تمام پہلوؤں میں مکمل ہے۔ اس کتاب مطلق کے بعد کسی اور وحی کی روز قیامت تک کوئی ضرورت باقی نہیں رہ گئی۔ یہ زندگی کے تمام اہم معاملات میں ضروری ہدایات فراہم کرتی ہے۔ اس کی ہمہ گیر ہدایتوں سے انسانی حیات کا ہر گوشہ روشن ومنور ہے۔ اس کی تعلیمات پر عمل کرکے ہی انسان اپنے خالق نیز دوسرے انسانوں سے اپنے تعلقات استوار کرسکتا ہے۔

قرآن کوئی معمولی کتاب نہیں ہے۔ ''ذالک'' ایک ایسی ضمیر ہے جو بلندی کے لئے بھی بولی جاتی ہے۔ قرآن کو ''ذالک الکتاب'' یعنی وہ کتاب'' اس لئے کہا گیا ہے تاکہ اس کی اعلیٰ ترین منزلت وعظمت کا اظہار ہو۔ اس کتاب کی عظمت وبزرگی نے اسے ''وہ'' بلندی عطا کی ہے جس کی وجہ سے اسے ''وہ کتاب'' کہا گیا ہے۔ تمام الہامی کتابوں میں سب سے بعد میں نازل ہونے والی یہ کتاب دنیا کی تاریخ میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے۔ ہزاروں لوگ اس کو از اول تا آخر حفظ کرتے اور اپنے قلوب کو منور کرتے ہیں۔

مستند وحی الٰہی:

'ریب' کے معنی شک کے ہیں اور اسے ''باطل'' کے معنی میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اس آیہ مبارکہ کے جملے ''اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے''۔ کے دو معنی نکلتے ہیں۔ اولاً یہ کہ قرآن بلاشک کلام الٰہی ہے۔ قرآن پہلے مرحلے ہی میں یہ واضح کردینا چاہتا ہے کہ اس کا ایک ایک لفظ من جانب اللہ ہے۔ تاریخی اعتبار سے بھی یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچی چکی ہے کہ تمام مذہبی صحیفوں میں صرف قرآن ہی اپنی اصلی شکل میں باقی ہے بقیہ ساری کتابیں جیسے ویدا، اوپنیشد، انجیل، توریت، زبور یا آویستا یا تو امتداد زمانہ سے تلف ہوگئیں یا تحریفات کا شکار ہوکر غیر مستند ہوچکی ہیں۔ ان تحریفات کا اعتراف خود اس کتاب کے ماننے والے بھی کرتے ہیں۔ جہاں تک قرآن کا سوال ہے تو اس کے سلسلے میں وہ لوگ بھی جو اسے کتاب

الٰہی ماننے پر تیار نہیں ہیں یہی رائے رکھتے ہیں کہ بعینہٖ وہی کتاب ہے جسے پیغمبر محمدؐ نے اپنی امت کے حوالے کیا تھا اور اس میں آج تک کوئی ترمیم یا تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ اس جملے کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ قرآنی تعلیمات کے بے عیب ہونے میں بھی کوئی شک نہیں ہے۔ دوسرے الفاظ میں انسان کی ہدایت کے لئے جو نظام زندگی قرآن پیش کررہا ہے حقیقتاً وہی نظام انسانیت کے لئے مفید ترین اور مستند ہے۔

قرآن کتاب ہدایت:

اب یہ آیت نزول قرآن کی اصل غرض وغایت کی جانب اشارہ کررہی ہے۔ قرآن کریم نہ تو تاریخ کی کتاب ہے اور نہ ہی قصص انبیاء کی۔ یہ نہ تو عقائد کی کتاب ہے اور نہ ہی قانون کی۔ یہ بنیادی طور پر نہ تو سائنس کی کتاب ہے اور نہ کوئی شاہکار ادب یہ نہ تو مجموعۂ مراسم ہے اور نہ ہی روایات کا ذخیرہ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن میں مذکورہ بالا تمام باتیں پائی جاتی ہیں مگر ان تمام چیزوں کی حیثیت قرآن کے تعلق سے ضمنی اور ثانوی ہے نہ کہ حقیقی۔ بنیادی طور پر قرآن ایک کتاب ہدایت ہے۔ یہ انسانی حیات کے مختلف زاویوں یعنی جسمانی، روحانی، ذاتی، اجتماعی، سیاسی اور اقتصادی مسائل کے تمام مراحل کے لئے مکمل ہدایت ہے۔ یہ کتاب انسان کو صراط مستقیم یعنی سچے راستے کی جانب ہدایت کرتی ہے، اور یہ صراط مستقیم عبارت ہے صحت عقاید اور صحت اعمال سے۔ یہ کتاب اہل عرب کے درمیان ایک شاہکار ادب کی شکل میں نازل نہیں ہوئی تھی بلکہ اس کے نزول کا اولین مقصد کاروان انسانیت کو اس کی منزل مقصود کی نشاندہی کرنا تھا۔ ہدایت کے تین مراحل ہیں۔ صحیح راستہ دکھانا، اس کی جانب رہنمائی کرنا، انسان کو منزل مقصود تک پہنچا دینا۔ اللہ کی ہدایت انسان کو رشد وکمال کی منزلیں طے کرنے میں مدد کرتی ہے اور یہ روحانی ارتقاء وپیشرفت موت آجانے کے بعد بھی نہیں رکتی بلکہ آخرت میں بھی جاری وساری رہتی ہے۔

سورۂ فاتحہ میں چونکہ بندۂ مومن اپنے رب کی بارگاہ میں صراط مستقیم کی جانب ہدایت

کرنے کی دعا کرتا ہے اس لئے اس سورۂ بقرہ کی ابتدائی آیتوں میں ہی اس دعا کے جواب میں خالق اس ہدایت کو پیش کرتا ہے۔ یعنی دوسرے الفاظ میں کہا جائے تو یہ کتاب جو اللہ کی جانب سے کتاب ہدایت بنائی گئی ہے۔ سورۂ حمد کی دعا کی قبولیت کے نتیجے میں ہمارے سامنے ہے۔

قرآنی ہدایت اور تقویٰ کا مفہوم:

قرآن کا یہ اعلان ہے کہ یہ متقین کے لئے ایک ہدایت ہے، یعنی ان حضرات کے لئے جن میں تقویٰ کی صفت پائی جاتی ہے۔

اسلامی طرز فکر کے مطابق خالق کائنات نے انسان کو ذوجہتین قرار دیا یعنی وہ اپنی ایک ذات میں حیوانی اور انسانی وجود ایک ساتھ رکھتا ہے۔ اس کی زندگی کے دو محور ہیں ایک حیوانیت اور دوسرے انسانیت۔ مذہب کا بنیادی کام یہ ہے کہ وہ انسان کو حیوانیت کی سطح سے بلند کر کے اعلیٰ انسانی اقدار تک پہنچادے۔ مگر انسان کے لئے دوبارہ حیوانیت میں گرنے کا خطرہ ہر وقت لاحق رہے گا۔ تقویٰ'' اس صفت کا نام ہے جو انسان کو حوانیت کی تاریکیوں میں گرنے سے بچائے رکھتی ہے۔ اور بلندترین انسانی صفات تک رسائی حاصل کرنے میں اس کے لئے مددگار ثابت ہوتی ہے۔ تقویٰ یعنی خوف خدا، ایسا خوف جو انسان کو گناہ اور برائی سے باز رکھے۔ عربی لغت کے اعتبار سے لفظ متقین کا مادہ ''وقی'' ہے جو حفاظت اور دور رکھنے کے معنی دیتا ہے۔ اس طرح سے متقی وہ انسان کہلائے گا جو ہر وقت گناہوں اور قبیح اعمال سے اپنے نفس کی حفاظت کرے۔ یوں تو سرسری طور پر ہمیشہ تقویٰ کا ترجمہ خوف خدا ہی کیا جاتا ہے مگر ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ خوف ایک منفی صفت ہے جبکہ تقویٰ نام ہے ایک مثبت فکر و عمل کا۔ تقویٰ اس درخت کا نام ہے جس پر نیک اعمال اور پاکیزگی کے پھل آتے ہیں۔ اسی وجہ سے کچھ مفکرین نے متقی کا ترجمہ پاک خصلت، خوف الٰہی رکھنے والا، پرہیزگار وغیرہ کیا ہے۔

اوپر دی گئی تمام صفات لفظ تقویٰ میں شامل ہیں۔ یہ مومن کی ایک ایسی سپر ہے جو فطری طور سے اسے ہر رجس و گناہ سے بچاتی ہے، دوسری جانب یہ مشیت الٰہی کے راستے پر

ثابت قدم رہنے کی ترغیب بھی دیتی ہے۔ متقین اللہ کے وہ نیک بندے ہیں جن کی زندگی کا محور ذات خدا ہے، اور جو اپنے ارادے واختیار کے ساتھ اعمال صالحہ انجام دیتے ہیں۔ پورے قرآن میں دو الفاظ کی بہت زیادہ تکرار کی گئی ہے۔ اولاً ایمان اور مومنین اور ثانیاً تقویٰ اور متقین۔ ایمان یعنی توحید پر یقین، اس اعتبار سے تقویٰ قلب کی اس کیفیت کا نام ہے جس کے ذریعے انسان ہمیشہ تعلیمات اسلام اور روح توحید کے مطابق اعمال انجام دے اور ہر اس فکر یا عمل سے اپنے آپ کو آگاہانہ طور پر دور رکھے جو روح توحید کے منافی ہیں۔ ظاہر ہے کہ تقویٰ کے اس بسیط اور عمیق تصور کو سمجھانے کے لئے اردو زبان کے دامن میں کوئی ایک لفظ نہیں ہے جو اس مفہوم کو کماحقہ دوسرے کے ذہن تک منتقل کر سکے۔ اسی سے ہم اسلام کی انفرادیت کا بھی اندازہ کر سکتے ہیں یعنی اسلام صرف مان لینے یا ایمان لے آنے کا نام نہیں ہے۔ اس کی تکمیل اس وقت تک ممکن ہی نہیں ہے جب ایمان لانے والا اپنے ایمان کا اظہار اعمال کی شکل میں نہ پیش کر دے۔ ایمان کی اہمیت اپنی جگہ پر مسلم ہے مگر یہ بھی اتنا ہی ضروری ہے کہ بندہ اپنے اخلاق وعمل سے اپنے اعمال کی تصدیق کرے اور اسی کا نام تقویٰ ہے۔

''متقین کے لئے ہدایت'' کے معنی

اس جملے کے معنی یہ ہیں کہ قرآن تو بنیادی طور پر کل انسانیت کے لئے نازل ہوا ہے مگر اس کتاب ہدایت سے حقیقی استفادہ وہی حضرات کر سکتے ہیں جن میں چند صفات پائی جاتی ہیں۔ جو لوگ اپنے حیوانی وجود سے بلند ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتے اور خواہشات نفسانی کی اندھی پیروی میں لگے ہوئے ہیں وہ اس کتاب الٰہی سے کسی بھی طرح کا فائدہ حاصل کرنے کی مطلقاً اہلیت ہی نہیں رکھتے۔

یہاں یہ سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ اگر قرآن صرف نیک اور صالح لوگوں کی ہی ہدایت کرتا ہے تو ان لوگوں کا کیا مقدر ہوگا جو ابھی ان صفات تک رسائی حاصل نہیں کر سکے ہیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کی ہدایت تو تمام انسانیت کے لئے عام ہے جیسا کہ

متعدد آیات سے ہمیں معلوم ہوتا ہے (۲۲:۲، ۱۸۶:۲، ۱۳۹:۳، ۴۲:۱۷، ۵۵:۱۸، ۵۹:۳۰) مگر اب یہ انسان کے اوپر ہے کہ وہ اس ہدایت سے فائدہ اٹھاتا ہے یا نہیں اور قرآن کے مطابق صرف صاحبان تقویٰ ہی اس ہدایت سے کماحقہ مستفید ہوسکتے ہیں۔

نظریۂ علم کی روشنی میں اس جملے کے معنی:

اس جملے سے ہم حصول علم سے متعلق نظریہ میں ایک اہم نتیجے تک پہنچتے ہیں۔ انسان کی نیت عمل اور اس کے علم میں ایک گہرا تعلق ہوتا ہے۔ علم کوئی مادی شئی نہیں ہے جو اپنے منکشف ہونے کا انتظار کرے۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان کسی شئی کے بارے میں ایک سرسری سا تعارف اور تصور پیدا کرلیتا ہے لیکن اس شئی کے بارے میں مکمل اور جامع علم حاصل کرنے کیلئے ضروری ہے کہ انسان اس کے بارے میں کھلے دماغ کے ساتھ تحقیق کرے۔ تحقیق کرتے وقت بھی یہ ضروری ہے کہ اس کا دماغ ایک صفحۂ سادہ کی طرح صاف ہو یعنی پہلے سے ہی وہ کوئی رائے اس شئے کے بارے میں قائم نہ کرے بلکہ یہ دیکھے کہ حقائق اسے کس جانب لے جارہے ہیں۔ ثانیاً یہ کہ علم ہمیشہ سعی مسلسل کے نتیجے میں حاصل ہوتا ہے۔ پیہم کوششیں کرنے سے انسان اشیاء کی حقیقت اور ان کی فطرت کا ادراک حاصل کرلیتا ہے۔

یہ آیت وحی الٰہی کے سمجھنے کے طریقے پر بھی روشنی ڈالتی ہے۔ وحی الٰہی کا مکمل ادراک انہیں حضرات کے لئے ممکن ہے جو صحیح فکر ونظریہ رکھتے ہوں۔ اس نظریہ کے بغیر قرآن سے ہدایت حاصل کرنا تو دور کی بات ہے کبھی کبھی اس سے غلط اور گمراہ کن نتائج بھی نکالے جاسکتے ہیں۔ انسان کو قرآن سے ہدایت حاصل کرنے کے لئے سچے محقق کی طرح کھلے دماغ سے اس کی تعلیمات کی جانب رجوع کرنا چاہیئے۔ اس طرح اس کا دامن کردار بھی داغدار نہیں ہونا چاہیئے ورنہ دنیاوی ہوا وہوس اس کے فہم وادراک کو متاثر کردیں گی۔

آیت ۲:۳ ''جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں''

ایمان بالغیب:

درست عقیدہ اور ایمان بالغیب قرآن سے ہدایت حاصل کرنے کی دوسری اہم شرط ہے۔ یہ جملہ بھی اسی نتیجے کی جانب اشارہ کرتا ہے کہ وحی الٰہی کو سمجھنے اور اس سے مفید ہدایت حاصل کرنے کیلئے انسان کے پاس صحیح فکر اور درست نظریاتی سانچہ(Idealogical Framewa\ork) ہونا کتنا ضروری ہے" الغیب" یعنی نگاہوں سے اوجھل یا ماورائے حواس۔ یہ لفظ ان تمام حقیقتوں کی جانب اشارہ کرتا ہے جن کا ادراک حواس کے حدود سے بالاتر ہو یا جو کسی خاص وقت میں انسان کی نگاہوں سے غائب ہو۔ یہ ایک نسبی اصطلاح ہے، کوئی شئی جو آج ہمارے لئے غیب کا درجہ رکھتی ہے کل عالم شہود میں شمار ہوسکتی ہے۔ اسی طرح کوئی شئی جو عوام الناس کے لئے غیب ہے، اہل علم وفضل کے لئے شہود کی منزلوں میں ہوسکتی ہے۔ مگر کچھ حقائق ایسے بھی ہیں جو تمام عالم انسانیت کے فہم و حواس کی گرفت سے باہر ہیں اور انہیں حقائق کو ہم غیب مطلق کہتے ہیں۔

ایمان بالغیب سے مراد ماورائے حواس حقیقتوں کے وجود پر ایمان ہے۔ ذات الٰہی ،ملائکہ اور یوم آخرت عالم غیب سے متعلق ہے۔ خالق کائنات کے وجود پر ایمان روحانی ارتقاء کی پہلی شرط ہے اور اللہ "غیب مطلق" ہے۔ اسی طرح آخرت کے حقائق عالم ارواح ، حیات بعد الموت، جنت اور جہنم، روز قیامت وغیرہ عالم غیب کے حدود میں آتے ہیں۔ اہلبیت اطہار علیہم السلام کی چند احادیث کے مطابق اس آیت میں لفظ "غیب" سے مراد بارہویں امام حضرت حجۃ ابن الحسن علیہ السلام ہیں جن کے بارے میں ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ وہ حضرت آج بھی زندہ ہیں مگر لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ ہیں۔ اس نظریہ کا مندرجہ بالا باتوں سے کوئی تضاد نہیں ہے کیونکہ حضرت حجت کی غیبت بھی عالم غیب ہی کا ایک پہلو ہے۔

تمام مذاہب عالم اس بات پر متفق ہیں اور اسی نقطے سے اپنی گفتگو کا آغاز کرتے ہیں کہ اس عالم رنگ وبو سے مافوق ایک دنیائے غیب بھی موجود ہے۔ درحقیقت ایمان بالغیب

ہی دین کی شناخت اور اس کی اساس ہے، جو اس پر ایمان نہ لائے وہ حقیقتاً دین ہی کا انکار کرتا ہے۔ اگر ہم ایک وسیع معنی میں دین کی تعریف کرنا چاہیں تو وہ یہی ہوگی کہ دین سے مراد غیب پر ایمان رکھنا ہے۔

یہاں یہ ضرور یاد رکھنا چاہیئے کہ غیب پر ایمان کے یہ معنی نہیں ہیں کہ خیالی اور غیر حقیقی اشیاء پر ایمان رکھا جائے۔ روح قرآن اس سے زیادہ بعید کوئی بات نہیں ہوسکتی کہ ہم یہ تصور کرلیں کہ قرآن مسلمانوں سے ایسے ایمان کا مطالبہ کرتا ہے جس کا عقل وفہم سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ قرآن دراصل ایسے ایمان کو ایمان ہی ماننے پر تیار نہیں ہے جسے عقل وخرد کی کسوٹی پر پرکھا جاسکے۔ (ملاحظہ ہو آیات ۵۳:۵۳، ۵:۶۲، ۲۰:۳۱، ۳:۱۹۰، ۴:۷۴، ۲۵) متعصب ناقدین کے اس اعتراض میں ذرہ برابر بھی سچائی نہیں ہے کہ قرآن غیر عقلی باتوں پر ایمان کا حکم دیتا ہے، تعصب کے پردوں کی وجہ سے یہ حضرات لفظ ایمان کے حقیقی معنی سے بے خبر ہیں۔ حقیقت امر یہ ہے کہ قرآن مسلمانوں کو ایسے کسی غیب پر ایمان رکھنے کا حکم نہیں دیتا جو دائرہ عقل سے خارج ہو۔ اس کائنات میں نہ جانے کتنی ایسی چیزیں ہیں کہ حواس کی گرفت سے آزاد ہونے کے باوجود ان کے وجود سے انکار ناممکن ہے۔ ذات باری تعالیٰ اپنے کمال مطلق اور لامحدود ہونے کی وجہ سے ہمارے محدود حواس وشعور کی گرفت سے باہر ہے اسی طرح ملائکہ اور آخرت کی ابدی حیات بھی ہماری نگاہوں سے اوجھل ہیں مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا صرف دکھائی نہ دینے کی وجہ سے ان کے وجود سے انکار کیا جاسکتا ہے؟ اگر ہمارے حواس کسی حقیقت کو محسوس نہ کرسکیں تو کیا اس حقیقت کے وجود ہی کا سرے سے انکار کردیا جائے؟ اس طرح یہ بات بالکل بے بنیاد ہے، جیسا کہ کچھ عیسائی مفسرین کا الزام ہے، کہ اسلام اپنے ماننے والوں پر مبہم اور غیر عقلی باتوں کو ایمان کے نام پر تھوپنا چاہتا ہے۔ سچائی تو یہ ہے کہ عیسائیت کا دامن خود اس مقام پر داغدار نظر آتا ہے، اور یہ خود اپنے ماننے والوں سے غیر عقلی عقائد (جیسے تثلیث) کو ماننے کا اصرار کرتی ہے۔

اس جملے ''جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں'' کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ مومنین اپنے تمام فرائض اور عبادات کو بغیر کسی مادی لالچ کے خلوص دل کے ساتھ انجام دیتے ہیں اور ان کی راہ میں آنے والی تمام مشکلات کو کمال صبر کے ساتھ برداشت کرتے ہیں ان اعمال صالحہ کی انجام دہی میں یہ حضرات قربانیاں بھی پیش کرتے ہیں حالانکہ ان کے سامنے کوئی ظاہری انعام یا جزا کا تصور نہیں ہوتا۔

اگر انسان کے پاس درست نظریہ نہ ہو اور وہ محسوسات کی دنیا سے بلند ہونے پر تیار نہ ہو تو یقیناً وہ وحی الٰہی سے فائدہ حاصل نہیں کرسکتا۔ وہ قرآن کو سمجھ ہی نہیں سکتا۔

''... اور نماز قائم کرتے ہیں''

مذہب صرف جاننے کا نہیں بلکہ جانکر عمل پیرا ہونے کا نام ہے:

یہ قرآن فہمی کی تیسری شرط ہے اور یہی متقین کی تیسری علامت ہے۔ قرآن سے حقیقی ہدایت حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ انسان اپنے عقاید کے عملی اظہار کے لئے حکم خدا کے سامنے سراپا اطاعت بن جائے۔ اسی راہ بندگی کے پہلے قدم کا نام ''صلوٰۃ'' ہے یعنی متقین وہ ہیں جو نمازیں ادا کرتے ہیں اور انہیں قائم کرنے میں ہر ممکن سعی کرتے ہیں۔ اسلامی طرز فکر کا یہ بھی ایک امتیاز ہے کہ یہاں علم کے ساتھ عمل کا گہرا تعلق پایا جاتا ہے۔ اگر انسان کا عمل اس کے علم کا ساتھ نہ دے سکے تو اس کا علم ادھورا ہی سمجھا جائے گا۔ صرف دین کی معرفت حاصل کرلینے بھر سے انسان کا شمار دینداروں میں نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ میدان عمل میں اپنے ایمان کے خلوص اور اپنی معرفت کی صداقت کا ثبوت نہ دے دے۔ ظاہر ہے کہ جب تک انسان کی فکر اس سانچے میں نہ ڈھلے گی اسوقت تک قرآن سے سچی ہدایت حاصل کرنا اس کے لئے دشوار ہوگا۔ اس نظریہ کے برعکس دنیا کے کچھ مذاہب صرف ایمان اور عقائد کے اقرار کرلینے ہی کو انسان کے لئے کافی قرار دیتے ہیں اور اس سے کسی عمل صالح کا مطالبہ نہیں کرتے (مثال کے طور پر عیسائیت اپنے معتقدین سے صرف یہ مطالبہ کرتی ہے کہ تم حضرت

عیسیٰ مسیح کو فرزند خداوند تسلیم کرو اور ان کو اپنا نجات دہندہ سمجھو۔ اس کے بعد تمہیں کسی عمل کی کوئی ضرورت نہیں ہے اب تمہاری بخشش کے لئے حضرت مسیح ذمہ دار ہیں)

اسلام اس نظریہ کی سرے سے نفی کرتا ہے اور اپنے پیغام کی ابتداء ہی سے یہ صاف کر دینا چاہتا ہے کہ اللہ کی راہ میں عملی سرگرمی دکھائے بغیر صرف عقیدے کی بنیاد پر انسان قرآن کی ہدایت کا حقدار نہیں بن سکتا۔

نماز کے معنی اور اس کی اہمیت (یومیہ نمازیں)

نماز کے لغوی معنی دعا کے ہیں۔ نماز اس عبادت کا نام ہے جسے مسلمانوں پر دن میں پانچ وقت واجب کیا گیا ہے۔ اسلام میں نماز ایک مستقل عبادت ہے جسے ایک خاص شکل عطا کی گئی ہے اور اسے دین کا ایک اہم جز قرار دیا گیا ہے۔ قرآن کی زبان میں ''صلوٰۃ'' ان تمام اعمال کا ایک علامتی نام ہے جو انسان خدا کی راہ میں انجام دیتا ہے۔ یہ در اصل اس رشتے کا نام ہے جو بندے کو اپنے معبود سے منسلک کر دیتا ہے۔ مختصر الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ نماز اس بات کی علامت ہے کہ انسان اپنی زندگی کے تمام سماجی، سیاسی، اور ذاتی مراحل میں اپنے خالق کا مطیع و فرمانبردار ہے۔ اسی لئے ترک نماز کو معبود کی نافرمانی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ منطقی طور پر یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ ایک طرف تو انسان اپنے خالق کی محبت اور اس کی اطاعت کا دم بھرے اور دوسری جانب اس محبت کے عملی اظہار میں پہلو تہی کرے۔ شاید یہی عبادت کا اصل مفہوم ہے کہ انسان اپنے جذبۂ عبدیت کو عمل کا لباس پہنا کر اسے منزل کمال تک پہنچادے۔

نماز ادا کرنے کے سلسلے میں ہمیشہ نبی کریمؐ اور آئمہ طاہرین نے تاکید فرمائی ہے۔ آٹھویں امام علی رضا علیہ السلام نے محمد ابن سنان کے ایک خط کے جواب میں تحریر فرمایا کہ نماز اس لئے بہت اہم ہے کہ یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی بزرگی کا اقرار اور ہر طرح کے شرک کا انکار ہے۔ نماز میں خداوند کریم کے حضور کھڑا ہونے کا احساس ایک بندہ مومن کے لئے

گناہوں سے اجتناب کا باعث ہوتا ہے اور ہر طرح کی برائی اور بدعنوانی کے مقابلے میں انسان کے لئے ایک سپر کا کام کرتی ہے۔

بعض حضرات عبادات کی اہمیت کو یہ کہہ کر کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ سب سوائے رسم کے اور کچھ نہیں۔ ان کا یہ کہنا ہے کہ چونکہ عبادت کا سیدھا تعلق انسان کی عقل وروح سے ہے لہذا اس میں کسی جسمانی عمل کو انجام دینے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر انسان کا دماغ سرکشی کی جانب مائل ہوتو جسم کا سجدہ کیا معنیٰ رکھتا ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر انسان اپنے خالق اور اپنے دین کے لئے سنجیدہ نہیں ہے اور روح مذہب سے آشنا نہیں ہے اور اس کے بعد بھی وہ عبادتیں انجام دیتا ہے تو یہ ریاکاری ہے لیکن اس کے برعکس یہ بھی منافقت ہے کہ انسان پہلے ایک دین اور طرز زندگی کو تو تسلیم کرے مگر اپنے اعضاء جسم اور اپنے اخلاق سے اس کا اظہار نہ کرے۔ خالق کی اطاعت کی ایک علامت ہونے کے علاوہ نماز انسان کی روح کو پاک وپاکیزہ بنانے کا ایک وسیلہ بھی ہے۔قرآن بھی یہ اعلان کرتا ہے کہ نماز کا مقصد لوگوں کے قلوب کو پاک کرنا ہے۔ (۲۹:۴۵) نماز کے ذریعے انسان کے قلب پر اللہ سے تعلق کا جو ایک دیرپا اثر قائم ہوتا ہے وہی دراصل پاکیزگی قلب وروح کا موجب ہے۔

قیام نماز ادائے نماز سے اہم ہے۔

صرف نماز کو ادا کردینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کے قیام کے لئے مسلسل سعی کرنا بھی لازم ہے۔ نماز کا قیام خلوص دل کے ساتھ اور ہر قسم کی آمیزش سے پاک ہونا چاہیئے۔ ''یقیمون'' لفظ ''اقام'' سے مشتق ہے جس کے معنیٰ کسی شئی کے قیام یا اس کے اہتمام و کمال انجام دینے کے ہیں۔ یقیمون یعنی وہ لوگ نماز قائم کرتے ہیں،اس کے ممکنہ معنیٰ اولاً تو یہ ہوسکتے ہیں کہ ایک مسلمان کو اپنی پوری زندگی میں نمازوں کو ادا کرنا چاہئے ثانیاً یہ کہ اسے نمازوں کو اپنے وقت معینہ پر ادا کرنا چاہیئے ثالثاً یہ کہ اسے اپنی نمازوں کو خلوص دل اور روح نماز کے ساتھ ادا کرنا چاہیئے۔ اسی طرح اس کا ایک مفہوم یہ بھی ممکن ہے کہ مسلمانوں کو نماز

ہمیشہ باجماعت ادا کرنا چاہیے جیسا کہ اسی سورے کی ۴۳ ویں آیت میں حکم دیا گیا ہے اور آخر میں یہ کہ انسان کو اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی نماز کی جانب رغبت دلانی چاہیے۔ پورے قرآن میں ہر مقام پر لفظ صلوۃ کے ساتھ ''اقام'' (یعنی قائم کرنا) کا استعمال خود اس بات کا ثبوت ہے کہ قیام نماز، ادائے نماز سے زیادہ اہم اور وسیع معنی رکھتا ہے۔ ''یقیمون الصّلوۃ'' کے سبھی پہلوؤں کو سمجھنے کے بعد ہی ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس جملے کی تکرار اور تاکید کے پیچھے قرآن کا مقصد کیا ہے۔

''اور اس میں سے خرچ کرتے ہیں جو ہم نے انہیں عطا کیا ہے''

اللہ کی راہ میں مال کی قربانی:

متقین کی جماعت میں شامل ہونے کی یہ ایک اور شرط ہے۔ جب بندۂ مومن کا ایک گہرا تعلق اپنے خالق سے قائم ہوجاتا ہے تو اس کے دل کے کسی کونے میں خدمت خلق کا جذبہ بھی انگڑائیاں لینے لگتا ہے۔ قرآن سے ہدایت حاصل کرنے کی یہی چوتھی شرط ہے یعنی انسان راہ خدا میں اپنا مال خرچ کرنے کو تیار ہوجائے، یہ انفاق درحقیقت انسان کے قرار بندگی کی تصدیق ہے۔ اپنے مال کو فی سبیل اللہ قربان کرکے انسان یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ دولت کا پجاری نہیں بلکہ مرضی خدا کا پابند ہے۔ اس طرح جذبۂ عبدیت کی تکمیل کے لئے یہ لازم ہے کہ انسان اپنے عقیدے اور نظریہ کے لئے مال خرچ کرنے پر راضی ہوجائے۔

آیت کے اس جملے کا اولین اور وسیع ترین مفہوم یہی ہے کہ انسان خدا کی راہ میں خیرات کرے۔ دولت، طاقت، رسوخ، جسمانی، اور ذہنی صلاحتیں غرض کہ ہر وہ نعمت جو انسان اللہ کی طرف سے حاصل کرتا ہے اسے اللہ کی راہ میں خرچ کیا جانا چاہیے۔ قرآن کے مطابق تمام مادی اور روحانی نعمتوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا اصطلاحی نام انفاق ہے۔

اس طرح اہل تقویٰ وہ حضرات ہیں جو نہ صرف اپنے مادی وسائل بلکہ اپنی روحانی اور ذہنی قوتیں جیسے علم، سائنس، ذہانت وغیرہ کو بھی خالق کائنات کی راہ میں قربان کرنے کے

لئے تیار رہتے ہیں۔ اللہ کی راہ میں انفاق کرنا نہ صرف انسانی سماج کی بہتری اور ارتقاء کی ضمانت ہے بلکہ اس کے ذریعہ سے انسان اپنے نفس کی چند بیماریوں جیسے دنیا پرستی اور بخل وکنجوسی سے بھی چھٹکارا حاصل کرلیتا ہے۔ یقیناً یہی وہ صفت ہے جو اس دنیا کو جنگ وجدل کی دنیا نہیں بلکہ انسانیت اور تہذیب کی دنیا بناسکتی ہے۔ یہ آیہ کریمہ مسلمانوں کے لئے دو طرح کے فرائض کا اعلان کرتی ہے اولاً اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی عبادت اور ثانیاً خدمت خلق۔ ان دونوں فرائض کا بیان اس لئے کیا گیا ہے تاکہ انسان کے عقائد کا انعکاس میدان عمل میں نمایاں ہوسکے۔

علامہ محمد رضا حکیمی حدیث شناسی

لوگوں کی معرفت

الف۔ قرآن کی نظر میں:

ا۔ لوگو ہم نے تو تم سبکو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور ہم نے ہی تمہارے قبیلے اور برادریاں بنائیں تا کہ ایک دوسرے کو شناخت کرے اس میں شک نہیں کہ خدا کے نزدیک تم سب میں بڑا عزت دار وہی ہے جو بڑا پرہیزگار ہو۔ (سورہ حجرات ۱۳)

۲۔ اور اس (کی قدرت) کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا پھر یکایک تم آدمی بن کر (زمین پر) چلنے پھرنے لگے اور اسی (کی قدرت) کی نشانیوں میں ایک یہ بھی ہے کہ اس نے تمہارے واسطے تمہاری ہی جنس کی بیویاں پیدا کیں تا کہ تم ان کے ساتھ رہ کر چین کرو اور تم لوگوں کے درمیان پیار اور الفت پیدا کردی۔ اس میں شک نہیں کہ اس میں غور کرنے والوں کے واسطے (قدرت خدا کی) یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں: (سورہ روم ۲۲۔۲۰)

حدیث کی نظر میں:

ا۔ حضرت علی علیہ السلام نے اپنے فرزند کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: یہ عقلمند شخص کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے کاموں کے سلسلہ میں غوروفکر کرے، اپنی زبان پر گرفت رکھے اور اپنے عہد کے لوگوں کو پہچانے۔ (امالی طوسی ۱/۱۴۶)

۲۔ حضرت امیر المومنینؑ نے فرمایا عقلمند کے لئے تین چیزیں ضروری ہیں۔ اپنے امور پر نظر رکھے، اپنی زبان قابو میں رکھے اور اپنے حالات پہچانتا رہے۔ (تحف العقول ۱۴۴)

ب۔ اہل حق کی معرفت حق:

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: خدا کے دین کو لوگوں سے پہچانا نہیں جاسکتا بلکہ حق کی علامتوں سے پہچانا جاسکتا ہے۔ لہٰذا حق کی معرفت حاصل کرو تا کہ اہل حق کو پہچان سکو۔ اے حارث! حق بہترین کلام ہے اور جو شخص بھی حق کو آشکار کرتا ہے وہ مجاہد ہے (بحار الانوار ۶۸/۱۲۰ از کتاب بشارۃ المصطفیٰ۔)

۲۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: تم نے اپنی طرف نہ دیکھا اور خود کو نہ پہچانا اسی لئے سرگرداں ہوئے! تم نے حق نہیں پہچانا (حق کو پہچانو) تا کہ حق والوں کی معرفت حاصل کرسکو اور نہ تم نے باطل کو جانا (باطل کو جانو) تا کہ باطل کی پیروی کرنے والوں کو پہچان سکو۔ (نہج البلاغہ ۱۲۳، عبدہ ۲/۲۰۸)

ج: آزمائشوں میں لوگوں کی پہچان:

۱۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: لوگوں کو سوائے آزمائشوں کے نہیں پہچانا جاسکتا۔ (بحار ۷۸/۱۰۲ از کتاب مطالب السؤول۔)

۲۔ حضرت امام حسن علیہ السلام نے اپنے ایک فرزند کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: اے نورنظر! اس سے قبل کہ تم کسی بھی کام میں کسی بھی شخص کے عادات واطوار اور اس کی آمد ورفت سے جب تک باقاعدہ آگاہ نہ ہوجاؤ اس وقت تک اپنی دوستی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں نہ دو لیکن جب کبھی کسی کو آزمالو اور اسے آزمائش میں پسند کرلو تو اس سے دوستی کا ہاتھ مضبوط کرلو لیکن اس شرط کے ساتھ کہ طرفین آپسی غلطیوں کو درگذر کریں گے۔ اور غربت وتنگدستی کی حالت میں کوئی بھی چیز ایک دوسرے سے پوشیدہ نہ کریں گے۔ (بحار۔ ۷۸/۱۰۵)

۳۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: جب کوئی بھی شخص کسی کو آزما لینے کے بعد اس سے تعلقات قائم کرتا ہے تو اس کی ہم نشینی میں استحکام اور دوستی میں استقامت پیدا ہوتی ہے۔ (غرر الحکم ۲۹۲)

۴۔حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام نے فرمایا: جو شخص کسی کو دوست بنانے میں یا برادرانہ تعلقات قائم کرنے سے قبل اسے آزمانہ لے وہ دھوکا کھاتا ہے اور اس کی صحبت میں تکلیف محسوس کرتا ہے۔(غرر الحکم ۲۹۲)

۵۔حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام نے حضرت مالک اشتر کے نام اپنے حکومتی عہد نامہ میں تحریر کیا: کہیں ایسا نہ ہو کہ تم لوگوں کا انتخاب اپنی فراست، خوش اعتمادی، اور حسن ظن کی بناء پر کرلو کیونکہ لوگ تصنع اور حسنِ خدمات کے ذریعہ حکمرانوں کی نظر میں سما کر تعارف کی راہیں نکال لیا کرتے ہیں۔ حالانکہ ان میں ذرا بھی خیر خواہی اور امانت داری کا جذبہ نہیں ہوتا۔لیکن تم انھیں ان خدمات سے پرکھو جو تم سے پہلے وہ نیک حاکموں کے ماتحت رہ کر انجام دے چکے ہوں۔پس جو عوام میں نیک نام اور امانت داری کے اعتبار سے زیادہ مشہور ہوں ان کی طرف خصوصیت کے ساتھ توجہ کرو۔ اس لئے کہ ایسا کرنا اس کی دلیل ہوگا کہ تم اللہ کے مخلص اور اپنے امام کے خیر خواہوں میں ہو۔(نہج البلاغہ ۱۰۱۵، عبدہ ۲/ ۱۰۲)

۶۔حضرت امام جواد علیہ السلام نے فرمایا: جو شخص کسی کو آزمانے سے قبل اس پر اطمینان حاصل کرے تو وہ معرض ہلاکت میں آجاتا ہے اور اس کی عاقبت رنج والم کی نذر ہوجاتی ہے (بحار ۷۸/ ۳۶۴)

۷۔حضرت صادق آل محمد علیہم السلام نے فرمایا: اگر زمانہ ظلم وستم کا زمانہ نہ ہو اور اس زمانے کے لوگ خیانت کار ہوں تو ہر ایک شخص پر اطمینان کرلینا احتیاط سے بعید امر ہے۔ (تحف العقول۔ ۲۶۲)

۸۔حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام نے فرمایا: جو شخص لوگوں کو نہیں پہچانتا وہ ان لوگوں پر اطمینان کرلیتا ہے۔(غرر الحکم ۲۷۴)

۹۔حضرت علی نے فرمایا: اس کو آزمالو ہوسکتا ہے کہ اس سے بیزار ہوجاؤ۔(نہج البلاغہ ۱۲۸۹: عبدہ ۲/ ۲۴۷)

۱۰۔حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام نے فرمایا: لوگوں سے دور رہنا ان کے حالات سے باخبر ہونے کے اندازہ پر موقوف ہے۔ (بحار۔ ۷۰/۱۱۱)

۱۱۔حضرت امام صادق علیہ السلام نے فرمایا: تین چیزیں علامات مومن میں سے ہیں خدا کے بارے میں اس کا علم ویقین اور یہ کہ وہ کس شخص کو دوست رکھتا ہے اور کس شخص سے بیزار ہے۔ (اصول کافی۔ ۲/۱۲۶)

۱۲۔حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے فرمایا: ایسا زمانہ جب کہ حق پر ظلم وستم غالب آجائے ایسی صورت میں بہتر نہیں کہ دوسرے کے حق کے بارے میں حسن ظن رکھا جائے مگر یہ کہ اسے آزمالیا گیا ہو۔ (تحف العقول۔ ۳۰۲)

دشمنوں کے بارے میں قرآن کا بیان:

۱۔ اگر کوئی شخص تم پر زیادتی کرے تو جیسی زیادتی اس نے تم پر کی ہے ویسی ہی زیادتی تم بھی اس پر کرو اور خدا سے ڈرتے رہو اور خوب سمجھ لو کہ خدا پرہیزگاروں کا ساتھی ہے۔ (سورہ بقرہ۔ ۱۹۴)

۲۔ اور ان سے (دشمنوں سے) لڑے جاؤ یہاں تک کہ فساد باقی نہ رہے اور صرف خدا ہی کا دین رہ جائے پھر اگر وہ لوگ باز رہیں تو ان پر زیادتی نہ کرو کیونکہ ظالموں کے سوا کسی پر زیادتی (اچھی) نہیں۔ (سورہ بقرہ۔ ۱۹۳)

۳۔ جو شخص خدا اور اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں اور (خاص کر) جبرئیل ومیکائیل کا دشمن ہو تو بے شک خدا بھی (ایسے) کافروں کا دشمن ہے۔ (سورہ بقرہ۔ ۹۸)

۴۔ اور ابراہیم کا اپنے باپ کے لئے مغفرت کی دعا مانگنا صرف اس وعدہ کی وجہ سے تھا جو انھوں نے اپنے باپ سے کرلیا تھا پھر جب ان کو معلوم ہوگیا کہ وہ یقینی خدا کا دشمن ہے تو اس سے بیزار ہوگئے۔ (سورہ توبہ۔ ۱۱۴)

۵۔ بے شک کفار تو تمہارے کھلم کھلا دشمن ہیں۔ سورہ نساء ۱۰۱

۶۔ اے ایماندارو! اگر تم میری راہ میں جہاد کرنے اور میری خوشنودی کی تمنا میں (گھر سے) نکلے ہو تو میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ۔۔(سورہ ممتحنہ ۱)

۷۔ اے ایماندارو! تمہاری ازواج اور تمہاری اولاد میں سے بعض تمہارے دشمن ہیں تو تم ان سے بچے رہو اور اگر تم معاف کردو اور درگزر کرو اور بخش دو تو خدا بخشنے والا مہربان ہے۔(سورہ تغابن ۱۴)

۸۔ اے اولاد آدم! کیا میں نے تمہارے پاس یہ حکم نہیں بھیجا تھا کہ (خبردار) شیطان کی پرستش نہ کرنا۔ وہ یقینی تمہارا کھلا دشمن ہے۔سورہ یس۔۶۰

دشمنوں کے بارے میں حدیث کا بیان:

۱۔حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: یاد رکھو لوگوں میں عقلمند ترین شخص وہ ہے جو اپنے رب کو پہچانے اور اس کے حکم کو لوگوں تک پہنچائے۔ اپنے دشمن کو پہچانے اور اس کے حکم کی نافرمانی کرے۔(بحار ۷۷/ ۱۷۹ از کتاب اعلام الدین۔)

۲۔حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: دشمن کو چاہے کمزور ہی کیوں نہ ہو، کبھی چھوٹا نہ سمجھو۔(غررالحکم ۳۳۳)

۳۔حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام نے فرمایا: جس شخص سے تم اپنا حق لینے کی قوت نہیں رکھتے اس سے حق کا مطالبہ نہ کرو۔(غررالحکم ۳۳۲)

۴۔حضرت علیؑ نے فرمایا: اپنے دشمن کی طرف سے چاہے وہ تمہاری تعریف ہی کیوں نہ کرے اطمینان سے نہ رہو۔(غررالحکم ۳۳۳)

۵۔حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: ہوسکتا ہے دشمن کی نرم زبان تمہیں دھوکا دیدے اس لئے کہ دشمن اس پانی کی طرح ہے جس کو گرم کرنے کے لئے چاہے جتنی آگ بھی روشن کی جائے وہ آگ کو بجھانے میں کوئی کسر نہیں اٹھاتا ہے(غررالحکم ۳۳۶)

۶۔حضرت علیؑ نے فرمایا: مضبوط ترین انسان کی سب سے بڑی نادانی و پریشانی دشمن کو

کمزور سمجھنا ہے۔(غرر الحکم ۱۳۶)

۷۔حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: ایک دشمن بھی زیادہ ہے۔(غرر الحکم ۲۵)

۸۔حضرت امام عسکری علیہ السلام نے فرمایا: سب سے کم فریبی دشمن وہ ہے۔ جو اپنی دشمنی ظاہر کردے۔(بحار۔ ۷۸/ ۳۷۷)

۹۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: جو شخص اپنی آرزو کی تکمیل کے لئے دشمن سے دوستی کرتا ہے تو اس آرزو کی تکمیل تک بہت سی چیزوں سے محروم ہوجاتا ہے۔(غرر الحکم ۲۹۴)

۱۰۔حضرت امیر المومنین نے فرمایا سب سے بڑا دشمن وہ ہے جو اپنے مکر فریب اور اپنی چالبازیوں کو بہت مخفی رکھے۔(مستدرک نہج البلاغہ ۱۵۷)

۱۱۔حضرت علی علیہ السلام نے مالک اشتر کے عہد نامہ حکومت میں تحریر فرمایا: اگر دشمن ایسی صلح کی تمہیں دعوت دے کہ جس میں اللہ کی رضا مندی ہو، تو اسے کبھی ٹھکرا نہ دینا کیونکہ صلح میں تمہارے لئے فکروں سے نجات اور شہروں کے لئے امن کا سامان ہے۔لیکن صلح کے بعد دشمن سے چوکنا اور خوب ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دشمن قرب حاصل کرتا ہے تا کہ تمہاری غفلت سے فائدہ اٹھائے لہٰذا احتیاط کو ملحوظ رکھو اور اس بارے میں حسن ظن سے کام نہ لو۔(نہج البلاغہ ۱۰۲۷، عبدہ ۱/ ۱۰۹)

بلا و مصیبت اور اس کی شناخت و تاثیر قرآن کی نظر میں:

۱۔آپ سے میرے ساتھ صبر نہ ہوسکے گا اور (سچ تو یہ ہے) جو چیز آپ کے علمی احاطہ سے باہر ہو اس پر آپ کیونکر صبر کرسکتے ہیں۔(سورہ کہف ۶۸)

۲۔ہمیں (آخر) کیا ہے کہ ہم اس پر بھروسہ نہ کریں حالانکہ ہمیں (نجات کی) اسی نے راہیں دکھائیں اور جو جو اذیتیں ہمیں پہونچائیں (ان پر ہم نے صبر کیا) اور آئندہ بھی صبر کریں گے اور توکل کرنے والوں کو خدا پر ہی توکل کرنا چاہیے۔(سورہ ابراہیم ۱۲)

حدیث کی روشنی میں:

۱۔حضرت امام صادق علیہ السلام نے پیغمبر اکرمؐ کے حوالے سے فرمایا: جو شخص بلا کو پہچانتا ہے اس پر صبر کرتا ہے اور جو اسے نہیں پہچانتا وہ اسے برا سمجھتا ہے۔(امالی صدوق ۴۳۹)

۲۔حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا: وہی شخص حق کے لئے صبر و شکر کرتا ہے جو اس کی فضیلت سے آگاہ ہوتا ہے۔(غرر الحکم ۳۴۹)

قرآن کی روشنی میں زمانہ و حوادث کی شناخت:

۱۔ یہ اتفاقات زمانہ ہیں جو ہم لوگوں کے درمیان باری باری الٹ پھیر کیا کرتے ہیں اور یہ (اتفاقی شکست اس لئے تھی) تا کہ خدا سچے ایمانداروں کو (ظاہری) مسلمانوں سے الگ دیکھ لے اور تم میں سے بعض کو درجہ شہادت پر فائز کرے۔

(سورہ آل عمران آیت ۱۴۰)

۲۔ یہ لوگ بھی انھیں سزاؤں کے منتظر ہیں جو ان سے قبل والوں پر گذر چکی ہے (اے رسول ان سے) کہدو کہ اچھا تم بھی انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ یقیناً انتظار کرتا ہوں۔ (سورہ یونس۔ ۱۰۲)

۳۔ اور ہم نے موسی کو اپنی نشانیاں دیکر بھیجا (اور یہ حکم دیا) کہ اپنی قوم کو (کفر کی) تاریکیوں سے (ایمان کی) روشنی میں نکال لاؤ اور انھیں خدا کے (وہ) دن یاد دلاؤ (جن میں خدا کی بڑی بڑی قدرتیں ظاہر ہوئیں) اس میں شک نہیں اس میں تمام صبر و شکر کرنے والوں کے واسطے (قدرت خدا کی) بہت سی نشانیاں ہیں۔(سورہ ابراہیم ۔ ۵)

حدیث کی روشنی میں:

۱۔حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: جو شخص زمانے کی معرفت رکھتا ہے اور واقعات و حادثات پر نظر رکھتا ہے وہ جان بوجھ کر اس سے غافل نہیں ہوتا۔(کافی ۸/ ۲۳)

۲۔حضرت علیؑ نے فرمایا: جو زمانہ کی نصیحت کو سمجھتا ہے وہ خوش گمانی میں زمانے کو

اپنا دل نہیں دیتا۔(غرر الحکم ۳۹۲)

۳۔حضرت علیؑ کا قول ہے کہ جو شخص خوش گمانی میں اپنا دل زمانے کے حوالے کردے گویا اس نے زمانے کے حالات سے نصیحت حاصل نہیں کی ۔(غرر الحکم ۲۵۹)

۴۔حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام نے فرمایا: جو شخص زمانے کے حالات سے نصیحت حاصل کرتا ہے وہ زمانہ سے صلح کرنے پر اعتماد نہیں رکھتا۔(غرر الحکم ۲۸۵)

۵۔حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام نے فرمایا: جو شخص بھی زمانے کی پستی سے سبق حاصل نہیں کرتا اور اسے نہیں پہچانتا اور حوادث زمانہ سے خود کو محفوظ نہیں رکھتا۔ اور گناہوں سے دامن نہیں بچاتا تو گناہ چاہے جتنا بڑا ہو اس کی نظر میں اس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ (بحار الانوار ۷۱/ ۲۴۲ از کتاب کنز الفوائد۔)

۶۔حضرت امیر المومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ اپنے وقت کا بامعرفت شخص وہ ہے جو رونما ہونے والے واقعات پر تعجب نہ کرے۔(غرر الحکم ۹۵)

قرآن کی روشنی میں تاریخ کے قوانین کی معرفت:

۱۔کیا یہ لوگ روئے زمین پر چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے کہ جو لوگ ان سے پہلے گذر گئے ان کا انجام کیسا ہوا حالانکہ وہ لوگ ان سے قوت میں بھی کہیں زیادہ تھے اور جس قدر زمین ان لوگوں نے آباد کی ہے اس سے کہیں زیادہ (زمین کی) ان لوگوں نے کاشت بھی کی تھی اور اس کو آباد بھی کیا تھا اور انکے پاس بھی ان کے پیغمبر واضح وروشن معجزے لیکر آچکے تھے (مگر ان لوگوں نے نہ مانا) تو خدا نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا مگر وہ لوگ (کفر وسرکشی سے) اپنے اوپر ظلم کرتے رہے۔(سورہ روم آیت ۹)

۲۔(اے رسول) یہ چند بستیاں ہیں جن کے حالات ہم تم سے بیان کرتے ہیں اور اس میں تو شک ہی نہیں کہ انکے پیغمبران کے پاس بہت واضح وروشن معجزے لیکر آئے مگر یہ لوگ جس کو جھٹلا چکے تھے اس پر بھلا کا ہے کو ایمان لانے والے تھے۔خدا یوں کافروں کے

دلوں پر علامت مقرر کردیتا ہے (سورہ اعراف ۱۰۱۔)

۳۔تم سے پہلے بہت واقعات گذر چکے ہیں۔پس ذرا روئے زمین پر چل پھر کر دیکھو تو کہ (اپنے اپنے وقت کے پیغمبروں کو) جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا۔(سورہ آل عمران ۱۳۷۔)

۴۔ (اے رسول) لوگوں سے کہدو کہ روئے زمین پر ذرا چل پھر کر دیکھو تو گنہگاروں کا انجام کیا ہوا۔(سورہ نمل آیت ۶۹)

حدیث کی روشنی میں:

۱۔حضرت صادق آل محمدؐ نے فرمایا: ہمارے آباء کرام نے حضرت علیؑ سے روایت کی ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: غافل ترین انسان وہ ہے جو دنیا کے بدلتے حالات سے نصیحت نہ حاصل کرے۔... اور عقلمند ترین انسان وہ ہے جو لوگوں کی عقل وفہم سے اپنی عقل وفہم میں اضافہ کرے۔(بحار ۷۷/۱۱۲)

۲۔حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: وہ چیزیں جو گذر چکی ہیں اگر اس سے عبرت قبول کرو تو جو کچھ باقی بچی ہوئی چیزیں ہیں اس پر نگاہ رکھو گے۔(نہج البلاغہ ۹۸۱، عبدہ ۸۱/۲)

۳۔حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: ایمان چار چیزوں پر تکیہ کئے ہوئے ہے۔صبر ویقین عدل اور جہاد... اور یقین کی بھی چار شاخیں ہیں روشن نگاہیں حقیقت رسی،عبرت اندوزی اور اگلوں کے طور طریقہ، چنانچہ جو دانش و آگہی حاصل کریگا اس کے سامنے علم وعمل کی راہیں واضح ہوجائیں گی اور جس کیلئے علم وعمل آشکار ہوجائے گا وہ عبرت سے آشنا ہوگا اور جو عبرت سے آشنا ہوگا وہ ایسا ہے جیسے پہلے لوگوں میں موجود رہا ہو۔(نہج البلاغہ ۱۰۹۹-۱۱۰۰،عبدہ ۲۰/۱۵۷)

۴حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام نے فرمایا:تمھیں ان عذابوں سے ڈرنا چاہئے جو تم سے پہلی امتوں پر ان کی بد اعمالیوں اور بدکرداریوں کی وجہ سے نازل ہوئے اور (اپنے)

اچھے اور برے حالات میں ان کے احوال و واردات کو پیش نظر رکھو اور اس امر سے خائف وترساں رہو کہ کہیں تم بھی انہیں جیسے نہ ہوجاؤ۔ اگر تم نے ان کی دونوں حالتوں پر غور کرلیا تو پھر اس چیز کی پابندی کرو جس کی وجہ سے عزت وبرتری نے ہر حال میں ان کا ساتھ دیا اور دشمن ان سے دور دور رہے اور عیش وسکون کے دامن ان پر پھیل گئے۔ اور نعمتیں سرنگوں ہوکر ان کے ساتھ ہولیں اور عزت وسرفرازی نے اپنے بندھن ان سے جوڑ لئے (وہ کیا چیزیں تھیں؟) یہ کہ وہ افتراق سے بچے اور اتفاق ویک جہتی پر قائم رہے۔ اسی پر ایک دوسرے کو ابھارتے تھے اور اسی کی باہم سفارش کرتے تھے۔ اور تم ہر اس امر سے بچ کر رہو جس نے ان کی ریڑھ کی ہڈی کو توڑ ڈالا اور قوت وتوانائی کو ضعف میں بدل دیا (اور وہ یہ تھا) کہ انھوں نے دلوں میں کینہ اور سینوں میں بغض رکھا ایک دوسرے کی مدد سے روگردانی اختیار کرلی اور باہمی تعاون سے ہاتھ اٹھالیا۔ اور تم پر لازم ہے کہ گذشتہ زمانے کے اہل ایمان کے واقعات وحالات میں غور وفکر کرو کہ (صبر آزما) ابتلاؤں اور (جانکاہ) مصیبتوں میں ان کی کیا حالت تھی؟ کیا وہ ساری کائنات سے زیادہ گرانبار تمام لوگوں سے زائد ابتلائے تعب ومشقت اور دنیا جہان سے زیادہ تنگی وضیق کے عالم میں نہ تھے؟ جنہیں دنیا کے فرعونوں نے اپنا غلام بنا رکھا تھا اور انھیں سخت سے سخت اذیتیں پہنچاتے اور تلخیوں کے گھونٹ پلاتے تھے اور انکی یہ حالت ہوگئی تھی کہ وہ تباہی وہلاکت کی ذلتوں اور غلبہ وتسلط کی قہر سامانیوں میں گھرتے چلے جارہے تھے نہ انھیں بچاؤ کی کوئی تدبیر اور نہ روک تھام کا کوئی ذریعہ سوجھتا یہاں تک کہ جب اللہ سبحانہ نے یہ دیکھا کہ یہ میری محبت میں اذیتوں پر پوری کوشش وکاوش سے صبر کئے جارہے ہیں اور میرے خیال سے مصیبتوں کو جھیل رہے ہیں تو ان کے لئے مصیبت وابتلاء کی تنگائے سے عافیت کی راہیں نکالیں اور انکی ذلت کو عزت اور خوف وہراس کو امن میں بدل دیا۔ چنانچہ وہ تخت فرماں روائی پر سلطان اور مسند ہدایت پر رہنما ہوئے اور انھیں امیدوں سے بڑھ چڑھ کر اللہ کی طرف سے عزت وسرفرازی حاصل ہوئی۔

پس غور کرو! کہ جب ان کی جماعتیں یک جا، ان کے خیالات یکسو اور دل یکساں تھے اور ان کے ہاتھ ایک دوسرے کو سہارا دیتے اور تلواریں ایک دوسرے کی معین و مددگار تھیں اور ان کی بصیرتیں تیز اور ارادے متحد تھے تو اس وقت ان کا عالم کیا تھا؟ کیا وہ اطراف زمین میں فرمانروا اور دنیا والوں کی گردنوں پر حکمراں نہ تھے؟ اور تصویر کا یہ رخ بھی دیکھو! کہ جب ان میں پھوٹ پڑگئی اور ان کی باہمی یکجہتی درہم و برہم ہوگئی۔ ان کی باتوں اور دلوں سے اختلافات کے شاخسانے پھوٹ نکلے، اور وہ مختلف ٹولیوں میں بٹ گئے اور الگ جتھے بنا کر ایک دوسرے سے لڑنے جھگڑنے لگے، تو نوبت یہ آگئی کہ اللہ نے ان سے عزت و بزرگی کا پیرا ہن اتار لیا اور نعمتوں کی آسائشیں ان سے چھین لیں اور تمہارے درمیان ان کے واقعات کی حکایتیں عبرت حاصل کرنے والوں کیلئے عبرت بن کر رہ گئیں۔ (نہج البلاغہ ۸۰۳-۸۰۱: عبدہ ۱/۴۱۲-۴۱۰)

۵۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: اپنے دل کو پند و نصیحت سے زندہ رکھو... گذشتہ لوگوں کے واقعات کو (اس دل کے) سامنے رکھو۔ اور انہیں اس طرح یاد کرو کہ جو تم سے پہلے تھے وہ گذر گئے ان کی زمینوں پر چلو پھرو، ان کے باقی ماندہ آثار کو دیکھو اور یہ بھی دیکھو کہ انھوں نے کیا کیا چیزیں چھوڑیں اور کہاں چلے گئے، وہ کہاں سے کہاں گئے۔

(نہج البلاغہ/ ۹۱۰-۹۰۹ عبدہ ۲/۴۰)

❁❁❁❁❁

وصی عقیل زاہر

نہج البلاغہ شناسی:

حضرت علیؑ اور عصری علوم ومعارف

علیؑ ابن ابو طالب علیہ السلام کے نام سے اور کارناموں سے سبھی لوگ بخوبی واقف ہیں اور ہزارہا کوششوں کے باوجود ان کے فضائل پر پردہ نہیں ڈالا جاسکا۔ ان کے علم کا لوہا تو ہر دور میں مانا گیا ہے لیکن کیا آپ جانتے ہیں کہ حضرت علیؑ کے خطبات اور ان کے فیصلے اگر عصر حاضر کی علمی کسوٹی پر بھی پرکھے جائیں تو صحیح نکلتے ہیں۔

جی ہاں ۱۴۰۰ سال پہلے بھی حضرت علیؑ کو آج کے دور کا سارا علم تھا چاہے، وہ علم حسابداری ہو یا مختلف النوع جدید علوم وفنون اور اصول قوانین۔

اپنی اس بات کے ثبوت میں چند ایسے نکتے پیش کرنا چاہتا ہوں جن سے حضرت علیؑ کے بے پایاں علم کا کچھ حصہ دنیا والوں کے سامنے آسکے۔

حضرت علیؑ اور عوام سے خطاب:

سید الرضی کا بیان ہے کہ حضرت علیؑ ایک ماہر ومؤثر خطیب تھے۔ ان کی اس بات کے دو مطلب نکالے جاسکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ مولا کو ہر چیز کا اتنا علم تھا کہ وہ کسی بھی موقع پر بات کرسکتے تھے۔ اور دوسرا یہ کہ ان میں بولنے کی وہ خوبی تھی جو ہر ایک کو باندھ لیتی تھی اور متاثر کرتی تھی۔

حضرت علیؑ اور علم حسابداری:

جو فیصلہ حضرت علی نے روٹی والے قصے میں دیا اس سے ہم سب واقف ہیں۔جو

لوگ اس قصے سے انجان ہیں ان کے لئے بتادوں کہ دو مسافر کہیں ملے۔ ایک کے پاس ۳ روٹیاں تھیں اور دوسرے کے پاس ۵ روٹیاں۔ دونوں نے سوچا کہ دونوں ساتھ بیٹھ کر کھالیں گے۔ تبھی وہاں ایک تیسرا شخص آیا اور کہا کہ مجھے بھی کچھ کھانے کو دے دو۔ اب روٹیوں کے ٹکڑے کئے گئے اور سب کو برابر کا حق چاہیے تھا لہذا ہر روٹی کے تین تین ٹکڑے کئے گئے۔ اور سب نے آٹھ آٹھ ٹکڑے کھائے۔ جاتے وقت وہ تیسرا شخص آٹھ درہم دے کر چلا گیا اور کہا کہ آپس میں بانٹ لینا۔ دونوں مسافروں میں اس بات پر بحث ہونے لگی کہ کسے کتنے درہم ملیں گے۔ بات حضرت علیؑ تک پہنچی اور جس کے پاس پانچ روٹیاں تھیں اسے سات درہم اور جس کے پاس تین روٹیاں تھیں اسے ایک درہم ملا۔

آیئے اب مولائے کائنات کے فیصلے کو آج کے علم کی روشنی میں پرکھیں۔ تیسرے مسافر کے آنے سے پہلے ایک مسافر کی پانچ روٹیاں ملادیں تھی اور دوسرے کی تین روٹیاں تو Ratio 5:3 کا تھا۔ جب تیسرا مسافر آیا تب سب کو برابر کا حصہ ملا یعنی اب 1/3.1/3:1/3 تو پہلے جسے 8 میں سے 5 روٹیاں مل رہی تھیں اب 1/3 مل رہی ہیں اس طرح دوسرے مسافر کو 8 میں سے 3 مل رہی تھیں تو اب 1/3 مل رہی ہے۔

Accounts میں ایک چیز ہوتی ہے Ratio of Sacrifice کہ کس نے کتنا گھاٹا یا نقصان اٹھایا، جس کا Formula ہے Old Ratio Minus New Ratio یعنی 5/8-1/3 اور 3/8-1/3 اگر ہم اسے حل کریں تو دیکھے گے کہ پانچ روٹی والے نے 7 حصوں کا گھاٹا اٹھایا اور تین روٹی والے نے ایک حصے کا۔ اور اسی طرح مولا نے درہم بھی بانٹے تو صاف ظاہر ہے کہ مولا اس Concept سے جو بیسویں صدی کی دین ہے آج سے 1400 سال پہلے بھی واقف تھے۔

حضرت علیؑ اور ٹیکس:

سید ارضی لکھ گئے ہیں کہ مولا فرماتے تھے کہ اگر کوئی قرض ملنے کی امید نہ ہو تو اس پر

زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔لیکن جس سال وہ قرض مل جائے اس سال اس پر زکوٰۃ دینا ضروری ہے۔

دنیا بھر کے Income Tax Departments بھی تقریباً یہیں بات کہتے ہیں کہ جس سال کی آمدنی ہو اسی سال ٹیکس بھرنا ضروری ہے۔

حضرت علیؑ اور Propriey حق ملکیت:

ملکیت کے کچھ امکانات ہیں جیسے خرچ ضرورت سے زیادہ نہ ہو۔کسی بھی کام میں غلط طرح سے منافع نہ کمایا جائے۔دوسرے کے کام میں اپنا حصہ نہ نکالا جائے۔مختصر طور پر کہیں تو کسی بھی شخص کا اپنے عہدے سے غلط فائدہ اٹھانا غلط ہے یہی Propriey ہے۔

اپنے ایک خطبہ میں جو مولا نے عاصم ابن زیاد کو دیا جب اس نے پوچھا کہ مولا آپ خراب لباس اور معمولی کھانے پر کیوں گزارا کرتے ہیں تو مولا فرماتے ہیں ''میں فضول خرچی اس لئے نہیں کرتا کہ عام آدمی کے لئے پیسہ کم نہ پڑے اور اس پر غربت نہ طاری ہو۔''

وہیں دوسری جگہ اپنے ایک خط میں امیر المومنین نے اپنے ایک افسر سے جس نے غبن اور ہیرا پھیری کی تھی سارا حساب مانگا اور غبن کی رقم کی بھرپائی بھی کرنے کو کہا۔ اگر ہم حضرت علیؑ کی زندگی کو غور سے دیکھیں تو ایسے کئی واقعات ملیں گے جہاں حضرت علیؑ نے دوسروں کے مال میں سے کسی کو یہاں تک اپنے رشتہ داروں کو بھی کچھ مال نہ لینے دیا۔

مولائے کائنات اور Economics علم اقتصادیات

آج Economics کے کئی فلسفے ہر ملک کی مالی حالت کو سدھارنے میں کام لائے جاتے ہیں۔آج ہر ملک کی Economy صرف Tax پر ہی منحصر ہے اور ملک کی ترقی کا دارومدار ان لوگوں پر ہے جو ٹیکس ادا کرتے ہیں۔کیوں کہ سرکار کا سارا خرچ سارے کام صرف اس پیسے سے ہوتے ہیں۔ جو Tax Payer سرکار کو دیتا ہے۔سرکاری Activities پر غریبوں کی ترقی منحصر ہے اس لئے Tax اور Tax Payer کا خیال ضروری ہے۔

یہی بات حضرت علیؑ نے چودہ سو سال پہلے مالک اشتر کو ایک خط میں لکھی تھی اس خط

میں مولا نے یہ بھی لکھا تھا کہ منافع خوروں پر خاص نظر رکھو کیوں کہ یہ لوگ ضروری چیزوں کی Supply روک کر ان چیزوں کے دام بڑھا کر بیچتے ہیں اور غلط طریقوں سے پیسہ کماتے ہیں۔ اس بات کا خیال رہے کہ ہر چیز صحیح دام پر صحیح طریقے سے سب کو ملنی چاہیے۔

آج کے دور میں ایسے لوگوں پر نظر رکھنے کے لئے کئی Act یا قانون بنائے جا رہے ہیں، Competition Act بھی اسی لئے بنایا گیا ہے کہ لوگوں کو ان کی ضرورت کی چیزیں صحیح دام پر صحیح طریقے سے ملے۔

اپنے ایک خط میں حضرت علیؑ نے لکھا ہے کہ کنجوسی میں ہر برائی چھپی ہے۔ اس بات کو اگر ہم Economics کے پیمانے پر تولیں تو دیکھیں گے کہ کتنی گہری بات ہے۔ اگر لوگ پیسہ خرچ نہیں کریں گے تو جو مال بازار میں ہے وہ بکے گا نہیں۔ مال نہیں بکے گا تو دوکاندار پیسہ نہیں کمائے گا۔ پیسہ نہیں کمائے گا تو اپنے مزدوروں کو تنخواہ کیسے دیگا اور آخر انہیں بے دخل کر دیگا۔ اور یہی حال اگر ہر جگہ ہوگا تو اتنے بے روزگار پیٹ بھرنے کے لئے غلط راستہ اختیار کر لیں گے۔

حضرت علیؑ اور آج کا سماج:

اپنے ایک خط میں مولا نے لکھا ہے کہ ایک ایسا بھی دور آئے گا جب فیصلے عورتوں سے پوچھ کر کے جائیں گے یا پھر حقوق عورتوں کے پاس ہوں گے نوجوانوں کو اونچی کرسیوں پر بٹھایا جائے گا۔ یہ بات بھی آج کے دور میں کتنی صحیح ہے۔ آج بڑی کمپنیوں میں Exective کی کرسی پر عورتیں ہی دکھائی دیتی ہیں اور زیادہ سے زیادہ کم عمر نوجوانوں کو اونچی کرسی دے دی جاتی ہے۔

اپنے ایک اور خط میں مولا نے لکھا تھا کہ چھوٹا کنبہ خوشی پانے کا سب سے آسان راستہ ہے، اس بارے میں کیا کچھ کہنا ضروری ہے۔

حضرت علیؑ اور علم Astronomy نجوم

Astronomy یعنی چاند ستاروں سے وابستہ علم۔ یہ ایک بہت مشکل

Sciene ہے، مگر مولا سے کیا چھپا تھا۔ اس علم میں بھی انہیں وہ مہارت حاصل تھی کہ کیا کہنا۔ معاویہ کے نام اپنے ایک خط میں حضرت علیؑ نے لکھا ہے کہ تم اپنی بدگمانی کے ساتھ اس مقام پر ہو جسے تباعی کی پتنگ بھی نہیں چھوسکتی ۔ یہ اونچائی میں ستاروں کے آخری جھرمٹ عیوق (Ayyuq) کے برابر ہے اگر مولا کو علم نہیں تھا تو انہیں یہ کیسے پتہ کہ عیوق کی اونچائی کتنی ہوتی ہے۔ اگر چہ کچھ دیر کے لئے مان لیں کہ کہیں نام سنا ہوگا تو آیئے ایک اور بات بتادوں۔ کسی نے ایک بار مولا سے مشرق اور مغرب کی دوری پوچھی تو مولا نے کہا ایک دن میں سورج جتنی دوری طے کرتا ہے۔ آج ہم سب جانتے ہیں کہ سورج نہیں گھومتا بلکہ دنیا کول گھومتی ہے۔ دنیا کے East اور West کی دوری 180 degree ہے اور زمین اس رفتار سے گھومتی ہے کہ یہ دوری بارہ گھنٹوں میں طے ہوتی ہے مگر ہم کو لگتا ہے کہ سورج ایک طرف سے دوسری طرف جارہا ہے۔ مولا کو یہ علم تھا تبھی انہوں نے یہ جواب دیا ورنہ یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ اس کونے سے اس کونے تک کی دوری یا کہہ دیتے اس شہر سے اس شہر تک کی دوری۔

یہی نہیں کسی نے ایک بار زمین سے سورج تک کی دوری جاننی چاہی تو جو جواب مولا نے دیا تھا اسے آج Scientifically ثابت کیا جاچکا ہے۔

ان چند مثالوں اور واقعات سے یہ بات پوری طرح واضح اور صاف ہوگئی ہے کہ حضرت علیؑ کے سینے میں علم کا جو سمندر لہریں لے رہا تھا آج دنیا اس کی بوندوں سے فیض یاب اور سیراب ہورہی ہے یہی نہیں دنیاوی علوم جتنی ترقی کریں گے حضرت علیؑ کے علم کے نقوش اور ابھریں گے۔

حوالے:

نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۴۲۰، ۴۴۴، ۵۱۱، ۵۴۰، ۵۴۲، ۵۶۰، ۵۹۱، اور خط نمبر ۲۔ ۲۶۳، ۲۶۷۔۶، ۳۰۴، ۳۸۸۔

غزوہ احزاب

پیغمبرؐ بنی قریظہ کی معاہدہ شکنی سے آگاہ ہو جاتے ہیں:

پیغمبرؐ اکرم کو اپنے مقرر کردہ افسران کے ذریعہ ایسے حساس موقع پر قبیلہ بنی قریظہ کی معاہدہ شکنی کی اطلاع مل گئی اور وہ اس خبر سے بہت پریشان اور رنجیدہ ہوگئے۔ انھوں نے فوری طور پر قبیلہ اوس اور قبیلہ خزرج کے نامور سرداران اسلام "سعد معاذ" اور "سعد عبادہ" کو اس سلسلے میں مستند اطلاع حاصل کرنے کے لئے تعینات کیا اور کہا کہ اگر ان لوگوں کی خیانت کی بات حقیقت پر مبنی ہو تو کلمۂ رمزیہ "عضل عضل وقارہ" کے ذریعہ پیغمبر کو مطلع کردیں اور اگر وہ لوگ اپنے معاہدہ پر قائم ہوں تو کسی رمز و اشارہ کی ضرورت نہیں ہے بلکہ مکمل اطلاع واضح عبارت میں ارسال کریں۔ یہ دونوں سردار دیگر دو لوگوں کے ہمراہ قبیلہ بنی قریظہ کے قلع کے قریب آئے اور کعب کے ساتھ پہلی ہی ملاقات کے دوران ان لوگوں نے اپنے اور پیغمبر کے بارے میں فحش اور نازیبا کلمات کے علاوہ اور کچھ نہ سنا۔ سعد نے غیبی الہام کے ساتھ کہا: خدا کی قسم، سپاہ عرب اس سرزمین سے چلی جائے گی، پیغمبر گرامی اس قلعہ کا محاصرہ کرلیں گے، تیری گردن توڑ ڈالیں گے اور تیرے قبیلے کو تباہی و بربادی کا شکار بنادیں گے۔"

اس ملاقات کے بعد وہ لوگ پیغمبر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فرمایا۔ "عضل وقارہ"

پیغمبر اکرمؐ نے زوردار آواز میں فرمایا۔" اللہ اکبر ، البشر وایا معشر المسلمین بالفتح۔" یعنی خدا سب سے بڑا ہے۔ اے جماعت مسلمین! تم لوگوں کو یہ خوشخبری مبارک ہو کہ عنقریب تمھیں کامیابی حاصل ہونے والی ہے۔ پیغمبر کے اس جملے سے اسلام کے

قائد اعظم کی غیر معمولی شجاعت وماہرانہ سیاست کی نشاندہی ہوتی ہے۔ انھوں نے مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے یہ جملہ اس لئے ارشاد فرمایا تھا کہ بنی قریظہ کی معاہدہ شکنی کی خبر سننے کے بعد مسلمانوں کا حوصلہ کمزور نہ ہونے پائے۔ ۲

قبیلہ بنی قریظہ کے ابتدائی حملات:

قبیلہ بنی قریظہ کا ابتدائی منصوبہ یہ تھا کہ حملہ کے ابتدائی مرحلہ میں وہ شہر مدینہ کو تباہ وبرباد کرڈالیں۔ مسلمان خواتین اور بچوں کو، جو گھروں کے اندر پناہ گزیں تھے، مرعوب وخوفزدہ کردیں، چنانچہ ان لوگوں نے شہر مدینہ میں اپنے اس منصوبے کو آہستہ آہستہ عملی جامہ پہنادیا۔

مثال کے طور پر قبیلہ بنی قریظہ کے نامور نوجوانوں نے خفیہ انداز میں شہر میں گشت لگانا شروع کردی۔ عبد المطلب کی بیٹی ''صفیہ'' اس سلسلے میں کہتی ہیں۔'' میں حسان بن ثابت کے گھر میں تھی اور حسان خود بھی اپنی زوجہ کے ہمراہ اسی گھر میں رہا کرتا تھا۔ اچانک میں نے ایک یہودی کو دیکھا کہ وہ خفیہ طور پر حصار کے اردگرد چکر لگا رہا ہے۔ میں نے حسان سے کہا کہ اس آدمی کی نیت خراب ہے۔ تم جاؤ اور اس شخص کو اس جگہ سے دور بھگادو۔ حسان نے جواب دیتے ہوئے کہا۔'' اے دختر عبد المطلب! میرے اندر اتنی طاقت نہیں ہے کہ میں اس کو قتل کرڈالوں۔ مجھے یہ ڈر لگ رہا ہے کہ اگر میں حصار کے باہر گیا تو پٹ جاؤں گا۔ آخر کار بدرجۂ مجبوری میں خود اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے اپنی کمر کسی اور لوہے کا ایک ٹکڑا اٹھایا اور اس پر ایسی چوٹ کی کہ اس کا کام تمام ہوگیا۔

خفیہ مسلمان اطلاعاتی افسروں نے پیغمبرؐ سے بتایا کہ بنی قریظہ نے قریش اور غطفان سے دو ہزار سپاہیوں کا مطالبہ کیا ہے تاکہ وہ قلعہ کے اندر ہی مدینہ میں داخل ہوجائیں اور مدینہ کو پوری طرح تباہ وبرباد کرڈالیں۔ یہ خبر پیغمبر کو اس وقت ملی جب مسلمان سپاہی خندق کی حفاظت میں سرگرم تھے تاکہ دشمن اس کو پار نہ کرسکے۔ بہرحال یہ خفیہ اطلاع ملتے ہی پیغمبر اکرمؐ نے زید بن حارثہ اور مسلمہ بن اسلم کی سپہ سالاری میں پانچسو سپاہیوں کو مدینہ کے اندر گشت

کرنے کے لئے تعینات کردیا اور انھیں یہ ہدایت دی کہ نعرہ تکبیر بلند کرتے ہوئے بنی قریظہ کے حملات کا ڈٹ کر مقابلہ کریں تا کہ تکبیر کی آواز سن کر مسلمان عورتوں اور بچوں کو اطمینان حاصل ہوسکے۔ ؎

ایمان وکفر کا مقابلہ:

جنگ احزاب سے قبل یہودیوں اور مشرکوں کی جماعت اسلام کے خلاف مختلف جنگیں لڑچکیں تھی لیکن ان جنگوں میں ان کا مقابلہ مسلمانوں کی مخصوص جماعت سے ہوا کرتا تھا اور ان جنگوں کو ایسی عمومیت بھی حاصل نہ ہوسکی تھی کہ پورے عربستان کو اسلام کی مخالفت پر آمادہ کیا جاسکے۔ چونکہ دشمنان اسلام اپنی تمام کوششوں کے باوجود نوعمر اسلامی حکومت کو نابود نہیں کرپائے تھے لہذا اس بار ان لوگوں نے مختلف قبائل کی مشترکہ فوج کی تشکیل کے ذریعہ اسلام کا کام تمام کرنے کا منصوبہ تیار کیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان لوگوں نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اپنے ترکش کا آخری تیر مارا تھا اور اپنی تمام فوجی واقتصادی طاقتوں کو بروی کار لاتے ہوئے ایک عظیم لشکر کی تشکیل کرلی تھی اور اگر مسلمانوں کی جانب سے مدینہ کی حفاظت کے لئے لازمی تدبیر نہ کی گئی ہوتی تو اس جنگ میں دشمنوں کو یقیناً کامیابی حاصل ہوجاتی۔

اسی وجہ سے دشمنان اسلام عرب کے نامور پہلوان ''عمرو بن عبدود'' کو اپنے ساتھ لے آئے تھے تا کہ اس کی شجاعت کی وجہ سے انھیں مسلمانوں کے خلاف جلد از جلد کامیابی حاصل ہوجائے۔ پس جنگ احزاب کے دوران جماعت شرک ولشکر اسلام کے دو پہلوانوں کے درمیان ہونے والے مقابلے سے یہ معلوم ہورہا تھا کہ کفر واسلام کے درمیان سیدھا ٹکراؤ ہے اور اس مقابلے کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کفر والحاد کے درمیان مقابلے کا منظر نگاہوں کے سامنے موجود ہے۔

سپاہ عرب کی ناکامیابی کی ایک وجہ وہی گہری خندق تھی جو ان لوگوں کے سامنے

موجود تھی اور دشمن کی فوج رات دن اس کوشش میں لگی ہوئی تھی کہ کسی طرح وہ اس خندق کو پار کرنے میں کامیاب ہوجائے لیکن خندق کی نگہبانی کرنے والوں کے حملات اور خود پیغمبر اکرمؐ کی دفاعی کوششوں کی وجہ سے وہ لوگ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوسکے۔

اس زمانہ میں غیر معمولی ٹھنڈک پڑرہی تھی اور چارہ وخوراک کی کمی کی وجہ سے لشکر عرب کے سپاہیوں اور ان کے جانوروں کی زندگی خطرہ میں تھی۔ حی بن اخطب اس جنگ کی آگ کو بھڑکانے میں کلیدی کردار ادا کررہا تھا۔ اس نے قبیلہ' بنی قریظہ سے خرما سے لدے ہوئے ۲۰ اونٹوں کی کمک حاصل کی لیکن سپاہ اسلام کے جانبازوں نے ان اونٹوں کوراستہ میں روک لیا اور سارا خرما مسلمان سپاہیوں کے درمیان تقسیم کردیا۔ ؎

ایک دن ابو سفیان نے درج ذیل مضمون کا ایک خط پیغمبرؐ گرامی کیخدمت میں ارسال کیا۔ ”میں تمہارے دین کی مکمل نابودی کے لئے ایک بڑا لشکر لے کر آیا ہوں لیکن کیا کروں۔ ایسا لگتا ہے کہ تم نے ہم سے مقابلہ کرنا مکروہ خیال کیا اور ہمارے اپنے درمیان ایک گہری خندق قائم کردی۔ میں نہیں جانتا کہ تم نے جنگ کا یہ طریقہ کس سے سیکھا ہے لیکن میں تمہیں یہ بتادینا چاہتا ہوں کہ جب تک ”احد“ جیسی بھیانک جنگ برپا نہ کرلوں واپس نہ جاؤں گا۔“

پیغمبرؐ گرامی نے ابو سفیان کے خط کا جواب دیتے ہوئے لکھا۔ ”رسول خدا محمد کی طرف سے فرزند حرب ابو سفیان کے نام... غیر معمولی غرور کی وجہ سے ایک مدت سے اپنے زعم ناقص میں تو نے یہ تصور کررکھا ہے تو اسلام کے روشن چراغ کو بجھا سکتا ہے لیکن تو اچھی طرح سمجھ لے کہ یہ تیرے بس کی بات نہیں ہے۔ تو جلد ہی شرمناک شکست کے ساتھ واپس چلا جائے گا اور میں مستقبل میں قریش کے بڑے بتوں کو تیرے سامنے چکنا چور کرڈالوں گا۔“ ؎

اس جواب سے نامہ نگار کے اٹل ارادہ وقطعی فیصلے کی نشاندہی ہورہی تھی ۔ چنانچہ یہ ایک تیر کی طرح لشکر شرک کے سپہ سالار کے دل کی گہرائیوں میں اتر گیا۔ قریش کو محمدؐ کی

صداقت وحق بیانی کا بخوبی اندازہ تھا اسی وجہ سے ان کے حوصلے ٹوٹ گئے پھر بھی وہ اپنی اسلام دشمن سرگرمیوں میں لگے رہے۔ ایک رات ''خالد بن ولید'' نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ اپنے مخصوص طریقے سے خندق پار کرلے لیکن ''اسید حضیر'' کی سپہ سالاری میں لشکر اسلام کے ۲۰۰ سپاہیوں کی کڑی نگرانی کی وجہ سے اسے پیچھے ہٹنا پڑا۔

پیغمبرؐ اسلام سپاہیان اسلام کی تقویت وحوصلہ افزائی کی طرف سے ایک لحہ کے لئے بھی غافل نہیں ہوتے تھے۔ وہ اپنی جوشیلی تقریروں اور پر حوصلہ بیانوں کے ذریعہ لشکر اسلام کے جانبازوں کو اپنے عقیدہ کی حفاظت کے لئے ہمیشہ آمادہ رکھتے تھے۔ ایک دن ایک عظیم الشان اجتماع کے دوران اسلامی سپاہ کے سپہ سالاروں اور فوجیوں کو خطاب فرمایا۔ اپنی تقریر کی ابتدا میں پروردگار عالم کی مختصر حمدوثنا کے بعد انھوں نے ارشاد فرمایا۔ ''دیکھو! اے سپاہیان اسلام! دشمن کے مقابلے میں ثابت قدمی سے کام لو اور اچھی طرح سمجھ لو کہ بہشت ان تلواروں کے سایہ میں ہے جو حق وعدالت وآزادی کی راہ میں چلائی جاتی ہیں۔''[۱]

سپاہ عرب کے پانچ سپاہی خندق پار کرلیتے ہیں:

عمرو بن عبدود، عکرمہ بن ابی جہل، ہبیرۃ بن وھب، نوفل بن عبد اللہ اور ضرار بن الخطاب نامی سپاہ عرب کے پانچ بہادروں نے جنگ کا لباس پہنا اور نہایت مغرور انداز میں ''سپاہ بنی کنانہ'' کے سامنے کھڑے ہوکر کہنے لگے۔ ''جنگ کے لئے آمادہ رہو۔ آج تم لوگوں کو معلوم ہوجائے گا کہ سپاہ عرب کا حقیقی بہادر کون ہے؟ اس کے بعد ان لوگوں نے اپنے گھوڑوں کو ایڑ لگائی اور ایک لمبی چھلانگ کے ساتھ خندق کے اس پار نکل گئے۔ جس جگہ سے ان لوگوں نے خندق پار کی تھی اس کا فاصلہ کم تھا اور خندق کی نگہبانی کرنے والے تیراندازوں کی رسائی بھی مشکل تھی۔ پھر بھی سپاہیان اسلام نے اس جگہ کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور سپاہ عرب کے دوسرے فوجی خندق پار کرنے میں ناکام رہ گئے۔

یہ پانچوں پہلوان، جو ایک کے مقابلے میں ایک والی لڑائی کے ارادہ سے آئے تھے،

خندق اور کوہ سلع کے درمیان ٹھہر گئے جو لشکر اسلام کا مرکز تھا۔عربستان کے یہ نامور پہلوان خصوصی غرور کے ساتھ اپنے گھوڑوں کے ساتھ کھلواڑ کرتے ہوئے تمسخر آمیز اشارہ وطعنہ زنی کے ذریعہ سپاہیان لشکر اسلام کو مقابلے کے لئے للکار رہے تھے۔

لیکن ان پانچ لوگوں میں وہ پہلوان جو دوسروں سے زیادہ ماہر وطاقتور تھا وہ آگے بڑھا اور باقاعدہ طور پر سپاہ اسلام کو جنگ کی دعوت دی اور للکارتے ہوئے اعلان کیا۔'' کیا تم لوگوں کے درمیان ایسا کوئی بہادر ہے جو میرا مقابلہ کرے ان کی'' ھل من مبارز۔'' کی آواز دھیرے دھیرے پورے میدان پر چھا گئی تھی اور لشکر اسلام کے سپاہیوں پر غیر معمولی لرزہ طاری ہوگیا تھا۔مسلمانوں کی خاموشی کی وجہ سے اس عرب پہلوان کے حوصلے بلند تھے۔ وہ بڑی زوردار آواز میں یہ کہہ رہا تھا کہ اے بہشت کے دعویدارو !تم لوگ کہاں ہو؟'' اس کے علاوہ غیر معمولی جسارت کے ساتھ کہا۔'' کیا تم مسلمان لوگ یہ نہیں کہتے کہ تمہارے مقتولین بہشت میں اور ہمارے مقتولین دوزخ میں چلے جاتے ہیں؟ کیا تم مسلمانوں میں سے کوئی ایک آدمی بھی ایسا نہیں ہے جو مجھے دوزخ بھیج دے یا میں اسے بہشت کی طرف روانہ کردوں؟ وہ یہ تمام باتیں بطور رجز اور بلند آواز میں کہہ رہا تھا۔ اس کے بعد اس نے کہا۔

'' میں تم لوگوں کو للکارتے للکارتے اتنا تھک گیا ہوں کہ اب میرے گلے سے آواز نہیں نکلتی۔''[۸]

بہر حال عمرو کی للکار کے مقابلے میں اسلامی سپاہ پر موت جیسی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔پیغمبر اسلام لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے یہ ارشاد فرمارہے تھے کہ تم میں سے کوئی ایک شخص آگے بڑھے اور مسلمانوں کو اس آدمی کے شر سے نجات عطا کردے لیکن حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام کے علاوہ[۹] جنگ کے لئے کوئی آمادہ نہ تھا۔ اور بدرجۂ مجبوری یہ مشکل حضرت علیؑ کے علاوہ اور کسی سے حل ہونے والی نہ تھی۔پیغمبرؐ نے اپنی تلوار علی کو دی اور ان کے سر پر ایک مخصوص عمامہ باندھتے ہوئے ان کے حق میں یہ دعا فرمائی۔'' خداوند ! علی کو

ہر بدی سے محفوظ رکھ۔ جنگ بدر میں عبیدۃ بن الحارث اور جنگ احد میں شیر خدا حضرت حمزہ ہم سے بچھڑ چکے۔ میرے پروردگار! علی کو رنج ومصائب سے محفوظ رکھ۔ اس کے بعد انھوں نے قرآن کی اس آیت کی تلاوت فرمائی۔ رب لاتذرنی فرداوانت خیر الوارثین۔" یعنی میرے پالنے والے! مجھے تنہا مت چھوڑ۔ تو بہترین وارث ہے۔" ۱۰

حضرت علیؑ بڑی تیزی سے آگے بڑھے تاکہ مقابلے میں ہونے والی تاخیر کی تلافی کی جا سکے۔ اس موقع پر پیغمبر نے وہ تاریخی جملہ ارشاد فرمایا۔" برزالایمان کله الیٰ الشرک کله۔" کل ایمان وکل کفر ایک دوسرے کے مدمقابل ہے۔ حضرت علیؑ نے دشمن کے لہجے اور اس کے قافیہ وردیف میں رجز خوانی فرمائی اور کہا:

" جلدی مت کرو۔ تم لوگوں کا منہ توڑ جواب دینے کے لئے ایک آدمی آ گیا۔" ۱۱

علیؑ کے پورے جسم پر اسلحے لگے ہوئے تھے اور مغفر سے ان کی آنکھیں چمک رہی تھیں عمرو نے اپنے مقابل کو سمجھنے کے لئے ان سے پوچھا۔" تو کون ہے۔"؟ علی نے جو اپنی صاف گوئی کے لئے مشہور تھے۔ کہا۔" میں علی بن ابی طالب ہوں۔" عمرو نے کہا۔" میں تمھیں قتل نہیں کروں گا کیونکہ تمہارے والد میرے قدیمی دوست تھے۔ مجھے تو تمہارے چچازاد بھائی کی تلاش ہے جس نے بڑے اطمینان سے تم کو میرے مقابلے کے لئے بھیج دیا ہے۔ میں تمھیں اپنے نیزہ کی نوک سے اٹھا کر ایسی حالت میں زمین و آسمان کے درمیان معلق رکھ سکتا ہوں کہ نہ تم زندہ رہو اور نہ مردہ۔"

ابن ابی الحدید کہتا ہے کہ میرے استاد تاریخ ابو الخیر تاریخ کے اس حصے کو پڑھاتے ہوئے کہا کرتے تھے کہ درحقیقت عمرو حضرت علیؑ سے جنگ کرتے ہوئے ڈرتا تھا کیونکہ وہ جنگ احد وبدر میں موجود تھا اور علیؑ کی شجاعت کا کرشمہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا چنانچہ اپنے ان فریب آمیز جملوں سے وہ حضرت علی کو جنگ سے دور رکھنا چاہتا تھا۔

حضرت علیؑ نے اس کی چاپلوسی کا جواب دیتے ہوئے کہا۔" تو میری موت کا غم مت

کر کیونکہ میں مارا جاؤں یا مارڈالوں دونوں صورت میں سعادت مند اور بہشتی ہوں۔ لیکن ہر حالت میں دوزخ کو تیرا انتظار ہے۔'' عمرو نے مسکراتے ہوئے کہا علی ! یہ منصفانہ تقسیم نہیں ہے کہ بہشت اور دوزخ دونوں تمہاری ہو۔''

اس موقع پر حضرت علیؑ نے اس معاہدہ کی یاد دلائی جو اس نے خانۂ کعبہ کے غلاف کو پکڑ کر خداوند عالم سے معاہدہ کیا تھا کہ جنگ کے میدان میں اگر کوئی پہلوان میرے سامنے تین تجاویز پیش کرے گا تو میں ان میں سے ایک ضرور قبول کرلوں گا۔ پس حضرت علی نے اس کے سامنے پہلی تجویز پیش کی کہ اسلام قبول کرلے۔ اس نے کہا یہ ہرگز ممکن نہیں ہے۔ علی نے دوسری تجویز رکھی کہ جنگ سے باز آجا اور محمد کو ان کے حال پر چھوڑ دے اور ہرگز معرکہ آرائی مت کر۔ اس نے یہ تجویز بھی ٹھکرادی اور کہا کہ یہ میری ندامت وشرمندگی کا باعث ہے۔ کل عرب شعراء میری مذمت میں شعر لکھیں گے میری ہجو گوئی کریں گے اور یہ خیال کریں گے کہ میں نے ڈر کی وجہ سے یہ کام کیا ہے۔ حضرت علیؑ نے آخری تجویز پیش کرتے ہوئے کہا اس وقت تیرا مدمقابل پیادہ ہے لہٰذا تو بھی گھوڑے سے نیچے آجا تا کہ ہم لوگ باہم جنگ کرسکیں۔'' اس نے کہا۔'' تمہاری تجویز بہت معمولی ہے اور میں یہ نہیں سمجھتا تھا کہ کوئی عرب ایسی تجویز رکھے گا۔ ۱۲

دو پہلوانوں کی معرکہ آرائی:

دونوں پہلوانوں کے درمیان لڑائی چھڑگئی اور دونوں کے اطراف میں اڑنے والی گردوغبار کی وجہ سے دیکھنے والوں کو ان لوگوں کا چہرہ بالکل نظر نہیں آرہا تھا البتہ تلواروں کے ٹکرانے کی آواز فضا میں گونج رہی تھی۔ جب تلوار سپر سے ٹکراتی تھی تو اس کی جھنکار کی زور دار آواز دیر تک فضا میں گونجتی رہتی تھی۔ تھوڑی دیر کی لڑائی کے بعد ''عمرو'' نے حضرت علیؑ کے سر پر تلوار مارنی چاہی لیکن علیؑ نے اپنی مخصوص سپر کے ذریعہ اس کے حملے کو ناکام بنادیا لیکن ان کے سر میں معمولی چوٹ ضرور آگئی۔ اس چوٹ کی پرواہ نہ کرتے ہوئے انھوں نے دشمن کے

پیروں پر ایک بھرپور وار کردیا۔ جس کی وجہ سے عمرو زمین پر ڈھیر ہوگیا۔

فضا میں اڑتی ہوئی گردوغبار کے درمیان تکبیر کی آواز بلند ہوگئی جو حضرت علی کی کامیابی کی علامت تھی۔ میدان جنگ میں ''عمرو'' کو تڑپتا ہوا دیکھ کر اس کے دوسرے ساتھیوں پر غیر معمولی خوف طاری ہوگیا اور وہ لوگ اپنے گھوڑوں کو ایڑ لگا کر خندق کے پار نکل گئے لیکن ''نوفل'' کا گھوڑا خندق کے اندر چلا گیا اور محافظین نے اس پر پتھر برسانا شروع کردیے۔ لیکن اس نے تیز آواز میں کہا۔ میرے اوپر سنگ باری کا یہ طریقہ بہادری کی علامت نہیں ہے۔ کوئی ایک آدمی خندق کے اندر آئے اور میرا مقابلہ کرے۔ علی خندق میں داخل ہوئے اور اسے قتل کر ڈالا۔

اس کے بعد لشکر شرک پر غیر معمولی خوف ودہشت طاری ہوگئی اور ابوسفیان پر سب سے زیادہ خوف طاری تھا۔ وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ حضرت حمزہ کا بدلہ لینے کے لئے سپاہیان اسلام نوفل کے جسم کا مثلہ کرڈالیں گے۔ اس نے ایک آدمی کو بھیجا کہ نوفل کے مردہ جسم کو دس ہزار دینار دے کر خرید لائے۔ پیغمبر نے کہا کہ لاش کو ان لوگوں کے حوالے کردو اور یہ بتادو کہ اسلام میں مردہ کی قیمت وصول کرنا حرام ہے۔

اس ضربت کی اہمیت:

ظاہری اعتبار سے دیکھا جائے تو علی نے ایک پہلوان کو ہی قتل کیا تھا لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو درحقیقت انھوں نے ان تمام لوگوں کو نئی زندگی عطا کردی تھی جو عمرو کی للکار سن کر لرزہ بر اندام ہوگئے تھے اور دوسری طرف حضرت علی کی اس ضربت نے لشکر کفار کے ان دس ہزار سے زیادہ سپاہیوں کے حوصلے پست کردئے جو اسلام کی مکمل نابودی کا مصمم ارادہ لیکر آئے تھے اور اگر ''عمرو'' اس لڑائی میں کامیاب ہوگیا ہوتا تو معلوم ہوتا کہ جانثاری کی قدروقیمت کیا ہے۔

جب اس کامیابی کے بعد حضرت علی علیہ السلام رسول خدا کی خدمت میں حاضر

ہوئے تو انھوں نے حضرت علیؑ کی ضربت کی عظمت وفضیلت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا "حضرت علی کی یہ ضربت ہماری امت کے جملہ اعمال سے افضل ہے کیونکہ لشکر کفر کے نامور پہلوان کی شکست کی وجہ سے عام مسلمان عزیز وسرفراز اور ملت شرک پوری طرح ذلیل ورسوا ہوگئی۔" [۱۳]

شجاعت وجوانمردی:

اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ عمرو نے نہایت قیمتی زرہ پہن رکھی تھی لیکن حضرت علیؑ نے اس کی طرف دیکھا تک نہیں بلکہ خلیفہ دوم نے حضرت علیؑ پر اعتراض کرتے ہوئے کہا بھی کہ آپ نے اس کے جسم سے اس کی قیمتی زرہ کیوں نہیں اتار لی۔

جب عمرو کی خواہر عزیز کو اپنے بھائی کے قتل کی خبر ملی تو اس نے کہا: مجھے اس بات کا قطعی افسوس نہیں ہے کہ میرا بھائی قتل کر ڈالا گیا کیونکہ وہ دست کریم کے ذریعہ قتل ہوا ہے البتہ اگر ایسا نہ ہوا ہوتا تو میں ساری زندگی اپنے بھائی کا غم مناتی۔ [۱۴]

بہر حال اب یہ دیکھنا ہے کہ اس نامور عرب پہلوان کے قتل کے بعد لشکر کفر کا کیا انجام ہوا۔

سپاہ عرب متفرق ہو جاتی ہے:

اسلام کے خلاف سپاہ عرب اور یہودیوں کی اس جنگ کا کوئی ایک مقصد نہ تھا۔ یہودیوں کو اسلام کی روز افزوں ترقی وغیر معمولی اشاعت ومقبولیت سے خطرہ محسوس ہوتا تھا اور قبیلہ قریش اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ اپنی دیرینہ عداوت کی وجہ سے اس جنگ میں شامل تھا۔ "غطفان"، "فزارہ" اور دیگر قبیلے والے خیبر کے مال کی لالچ میں اس جنگ میں شریک ہوگئے تھے کیونکہ مقامی یہودیوں نے ان لوگوں سے یہی وعدہ کر رکھا تھا کہ کافی مقدار میں مال دنیا حاصل ہوگا۔ چونکہ اس آخری جماعت نے مادی مقصد حاصل کرنے کے لئے اس جنگ میں شرکت اختیار کی تھی اور اگر ان لوگوں کا یہ مادی مقصد مسلمانوں کے ذریعہ پورا ہو جاتا

تو وہ خوشی خوشی اپنے گھروں کی طرف چل پڑتے۔ لیکن کڑاکے کی سردی، چارہ کی کمی اور محاصرہ کی طولانی مدت کی وجہ سے یہ لوگ پوری طرح عاجز ہو چکے تھے اور ان کے جانور بھی بالکل کمزور اور مردہ حالت اختیار کر چکے تھے۔

ان حقائق کو نگاہ میں رکھتے ہوئے پیغمبر اکرم نے کچھ لوگوں پر مشتمل ایک وفد بنایا اور ان لوگوں کو یہ ذمہ داری سونپی کہ وہ مذکورہ قبیلے کے سرداروں سے معاہدہ کریں کہ مدینہ والے اپنے پھلوں کا ایک تہائی حصہ تمہیں دینے کے لئے تیار ہیں بشرطیکہ تم لوگ احزاب" کی صف سے علیحدگی اختیار کرتے ہوئے اپنے علاقوں کی طرف واپس چلے جاؤ۔ پیغمبر کے نمائندوں نے ان قبیلے کے سرداروں کے ساتھ معاہدہ کی تمام شرطیں طے کیں اور آخری مرحلہ میں دستخط کے لئے ان کے سامنے پیش کر دیا۔ پیغمبر نے اس واقعہ کا ذکر لشکر اسلام کے دو بڑے افسران یعنی "سعد معاذ" اور "سعد عبادہ" سے کیا۔ ان دونوں افسروں نے متفقہ طور پر کہا کہ اگر یہ معاہدہ حکم خداوندی کی پیروی میں کیا جارہا ہے تو انہیں قبول ہے لیکن اگر یہ آنحضرت کی ذاتی رائے ہے اور اس سلسلے میں ہم لوگوں کی رائے جاننا چاہتے ہیں تو ہم لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اس معاہدہ کو اسی جگہ ختم کر دیا جائے اور اس راہ میں ہرگز آگے قدم نہ بڑھایا جائے کیونکہ ہم لوگوں نے کسی زمانہ میں ان قبائل کو کبھی خراج نہیں دیا ہے اور ان جماعت کے لوگوں میں کبھی اتنی ہمت نہیں ہوئی کہ وہ طاقت کے ذریعہ ہمارے باغ کا ایک خرما بھی ہم سے حاصل کر لیں اور اب تو عنایت خداوندی کا سایہ ہم لوگوں کے سر پر موجود ہے۔ آپ کی رہنمائی میں ہم لوگ اسلام سے مشرف ہو چکے ہیں اور اس دین کی وجہ سے خداوند عالم نے ہم لوگوں کو عزت واحترام کا حامل بنا دیا ہے۔

"خدا کی قسم ہم لوگ ان کے ناجائز وبیہودہ مطالبات کا جواب اپنی تلوار سے دیں گے تاوقتیکہ خداوند عالم کی طرف سے تمام معاملات حل ہو جائیں۔" ۱۵

پیغمبر اکرمؐ نے ارشاد فرمایا کہ میں ان لوگوں کے ساتھ یہ معاہدہ اس لئے کرتا

چاہتا تھا کہ تم لوگ چاروں طرف سے سپاہ عرب کا نشانہ بنے ہوئے ہو اور ہر طرف سے تم لوگوں پر حملے کئے جارہے ہیں۔ میں نے سوچا کہ ان معاہدوں کے ذریعہ دشمن کے ناجائز اتحاد کو توڑ دیا جائے لیکن تم لوگوں کی فداکاری پوری طرح نمایاں ہوچکی ہے لہٰذا میں اس معاہدہ کو اسی جگہ ختم کرتے ہوئے تم لوگوں کے سامنے مکمل ایمان واعتماد کے ساتھ یہ اعلان کررہا ہوں کہ خداوند عالم نے اپنے پیغمبر کو کبھی خوار ورسوا نہیں کیا اور وہ شرک پر توحید کی مکمل فتح کے ذریعہ اپنے وعدہ کو پورا کرے گا۔ اس موقع پر ''سعد معاذ'' نے پیغمبر کی اجازت سے معاہدہ نامہ پر نوشتہ شدہ مضمون کو کاٹتے ہوئے کہا: بت پرستوں کی جماعت ہم لوگوں کے خلاف جو اقدام کرنا چاہتی ہے کرے ہم لوگ خراج دینے والی قوم نہیں ہیں۔[۱۶]

سپاہ عرب کے درمیان تفرقہ کے اسباب:

۱۔اس کا پہلا سبب ''قبیلہ غطفان'' اور قبیلہ ''فزارہ'' سے پیغمبر کے نمائندوں کی گفتگو میں حاصل ہونے والی کامیابی تھی۔ درحقیقت اس معاہدہ کو عملی جامہ تو نہیں پہنایا جاسکا تھا لیکن اس کی تردید وخرابی کا اعلان بھی نہیں کیا گیا تھا جس کی وجہ سے ان قبائل سے وابستہ افراد دو دل ہوگئے تھے اور ہر دن اس بات کے لئے منتظر تھے کہ آج معاہدہ پر دستخط ہوجائیں گے۔ چنانچہ جب ان لوگوں سے عمومی حملے کا مطالبہ کیا جاتا تو وہ کسی نہ کسی بہانے سے اس کو ٹال دیا کرتے تھے اور اس فکر میں لگے ہوئے تھے کہ معاہدہ ہوجائے اور یہ لوگ اپنے گھر واپس چلے جائیں۔

۲۔تفرقہ واختلاف کا دوسرا اہم سبب نامور عرب پہلوان ''عمرو'' کا قتل تھا۔ کیونکہ زیادہ تر لوگوں کو یہ امید تھی کہ وہ کامیاب ہوجائے گا لیکن اس کی موت کی وجہ سے ان تمام لوگوں کی امیدوں پر پانی پھر گیا اور عمرو کے ساتھ خندق پار کرنے والے دیگر پہلوانوں کے فرار کی وجہ سے عام لوگ زیادہ مایوس ہوگئے۔

۳۔نعیم بن مسعود نامی نومسلم نے لشکر کفر کے اتحاد کو نیست ونابود کردینے میں غیر معمولی موثر واہم کردار ادا کیا۔ اس نے سپاہ مشرکین کو متفرق کرنے کے لئے موثر ترین منصوبہ

تیار کیا اور اس کی سرگرمیاں دور حاضر کے نامور جاسوسوں کی سرگرمیوں سے کچھ کم نہ تھیں بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو اس کی سرگرمیاں زیادہ اہم اور موثر معلوم ہوں گی۔

وہ پیغمبر کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا: میں ایک نومسلم ہوں اور تمام قبیلوں کے ساتھ میری دیرینہ دوستی ہے اور ان لوگوں کو میرے اسلام قبول کرنے کی اطلاع بھی نہیں ہے۔ اگر آپ کا کوئی حکم ہو تو میں اس کو عملی رنگ وروپ دینے کے لئے ہمہ تن آمادہ ہوں۔ پیغمبر نے اس سے فرمایا کہ ایسا کام کرو کہ یہ لوگ متفرق ہو جائیں۔ اگر مصالح عالیہ کی حفاظت کے لئے اس راہ میں کوئی اہم منصوبہ بناؤ تو بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ لیکن ان باطل طاقتوں کے اتحاد کا درہم برہم ہونا ضروری ہے۔ 12

"نعیم" کچھ دیر تک غور وفکر کرتا رہا پھر وہ قبیلہ بنی قریظہ کی طرف چلا گیا جو درحقیقت سپاہ کفر کا پانچواں ستون تھا اور مسلمانوں کو لگاتار دھمکی بھی دے رہا تھا۔ وہ قبیلہ بنی قریظہ کے قلعہ کے اندر داخل ہوا اور ان لوگوں کے ساتھ اپنی دیرینہ دوستی اور غیر معمولی خلوص کا مظاہرہ کرنے لگا۔ اس کے چہرے سے بھی ہمدردی وخلوص ظاہر ہو رہا تھا۔ آخر کار اس نے ایسی مخلصانہ وہمدردانہ گفتگو کی کہ ان لوگوں کو اس کی دوستی پر مکمل اعتماد ہوگیا۔ جب ان لوگوں کو اپنی طرف ہمہ تن متوجہ کر لیا تو ان لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ اس متحدہ احزاب کے درمیان یعنی قریش اور قبیلہ "غطفان" سے تمہاری حیثیت بالکل مختلف ہے کیونکہ مدینہ تمہاری عورتوں اور تمہارے بچوں کا مسکن اور تمہاری مرکزی رہائشگاہ ہے۔ تمہارا سارا سرمایہ اسی شہر کے اندر ہے اور اس بات کا قطعی کوئی امکان نہیں ہے کہ تم اس شہر کو چھوڑ کر کسی دوسری جگہ منتقل ہو جاؤ۔ لیکن اس متحدہ محاذ میں شامل دیگر احزاب والے جو محمد سے جنگ کرنے کے لئے اس شہر میں موجود ہیں وہ مدینہ سے بہت دور رہتے ہیں اور ان کا تجارتی کاروبار اور مسکن اس شہر سے کافی دور واقع ہے۔

اگر ان لوگوں کو مناسب موقع ہاتھ آگیا اور اس جنگ میں انھیں کامیابی حاصل ہوگئی

تو یقیناً یہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوجائیں گے لیکن اگر اس جنگ میں ان لوگوں کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا تو یہ لوگ یہاں سے بھاگ کر اتنی دور چلے جائیں گے کہ محمد اتنی دور تک ان تعاقب بھی نہ کرسکیں گے۔

پس تم لوگ غور وفکر سے کام لو اور سوچو کہ متحدہ محاذ کی شکست کی صورت میں جب یہ لوگ مدینہ سے کوسوں دور اپنی مرکزی رہائشگاہ کی طرف روانہ ہوجائیں گے تو تم لوگ مسلمانوں کے چنگل میں رہوگے اور کوئی تمہاری مدد کرنے والا نہ دکھائی دے گا۔ لہٰذا مصلحت کا تقاضہ ہے کہ تم احزاب میں اپنی شمولیت کے فیصلے پر قائم رہو لیکن جنگ کے دوران دیگر احزاب تمہیں تنہا چھوڑ کر راہ فرار اختیار نہ کرسکیں اس کام کو حتمی اور عملی بنانے کیلئے تم لوگ دوسرے قبیلے کے چند اشراف اور موثر افراد کو یرغمال کی حیثیت سے اپنی تحویل میں رکھو تا کہ مصیبت اور سختی کے زمانے میں یہ لوگ تمہیں تنہا چھوڑ کر بھاگ نہ سکیں۔ اگر تم لوگ ایسا کرنے میں کامیاب ہوگئے تو وہ لوگ اپنے بزرگوں کی نجات کو نگاہ میں رکھتے ہوئے آخری دم تک محمد کے خلاف نبرد آزمائی میں سرگرم رہیں گے اور تم لوگوں کو تنہا چھوڑ کر بھاگ نہ سکیں گے۔

''نعیم'' کا یہ منصوبہ متفقہ طور پر منظور ہوگیا اور اسے بھی یہ اطمینان ہوگیا کہ اس بات کا ان لوگوں کے دل پر خاطر خواہ اثر ہوا ہے۔ اس کے بعد وہ ان کے قلعہ سے باہر نکلا اور احزاب کے خیمہ میں گیا۔ سرداران قریش کے ساتھ اسکی دیرینہ دوستی تھی اور اس نے اپنے پرانے دوستوں سے ملاقات کی اور ان سے کہا کہ ''قبیلہ بنی قریظہ'' والے محمد کے ساتھ اپنی عہد شکنی پر بہت نادم وشرمندہ ہیں اور سردست وہ اس کی تلافی کرنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا ان لوگوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ تمہارے بعض سرداروں اور افسروں کو یرغمال کی حیثیت سے محمد کے حوالے کردیں تا کہ تم لوگوں کو ان لوگوں کی صداقت پر یقین ہوجائے اور وہ تمہارے سرداروں کو فوراً قتل کرڈالیں۔ وہ لوگ اس سلسلے میں محمد سے پہلے ہی گفتگو کرچکے ہیں اور ان سے یہ وعدہ بھی کرچکے ہیں کہ وہ محمد کا ساتھ دیتے ہوئے آخری دم تک تمہارے

خلاف جنگ کریں گے اور محمد نے بھی اس معاہدہ کے سلسلے میں اپنی موافقت کا اعلان کردیا ہے۔

پس اگر یہود تم سے یرغمال کی حیثیت سے تمہارے کچھ سرداروں کا مطالبہ کریں تو تم لوگ موافقت کا اظہار نہ کردینا ! اچھی طرح سمجھ لو کہ اس موافقت کا انجام بہر حال خطرناک ہے۔ اگر تم میری اس تجویز پر گواہ چاہتے ہو تو کل تم ان لوگوں سے یہ مطالبہ کرو کہ وہ پیچھے سے سپاہ اسلام پر دھاوا بول دیں تو وہ تمہاری اس بات کو ہرگز قبول نہ کریں گے۔ بلکہ وہ یقیناً تم لوگوں کے سامنے یرغمال والا مطالبہ پیش کردیں گے۔

اس کے بعد وہ ''قبیلہ غطفان'' کے خیمہ میں گیا اور ان لوگوں سے نہایت مخصوص انداز میں کہا کہ اے قبیلہ غطفان والو! میری اصل اور بنیاد تم ہی لوگ ہو۔ میں نہیں سمجھتا کہ تم لوگ میری بات کو غلط سمجھو گے۔ میں تم لوگوں سے کچھ باتیں بتادوں گا لیکن میری تمنا یہ ہے کہ تم لوگ اس کا ذکر کسی سے نہ کروگے۔ ان لوگوں نے نہایت خلوص وصداقت کے ساتھ اس کی بات قبول کرلی۔ اس کے بعد اس نے قبیلہ قریش سے جو کچھ کہا تھا اس کو تفصیلی طور پر ان لوگوں کے سامنے بیان کردیا اور ان لوگوں کو اس بات کی طرف بھی متوجہ کردیا کہ بنی قریظہ کے اس کارنامہ کا نتیجہ کیا ہوگا۔ پھر ان لوگوں سے تاکید کرتے ہوئے فرمایا دیکھو! تم اپنے بزرگوں یا سرداروں کو یرغمال بنانے کے لئے آمادہ نہ ہوجانا۔

اس طرح بڑی حسن وخوبی کے ساتھ اپنا فریضہ پورا کرنے کے بعد نعیم مخفیانہ طور پر لشکر اسلام میں دوبارہ شامل ہوگیا اور لشکر اسلام کے درمیان اس بات کا زور دار پروپگنڈہ شروع کردیا کہ قبیلہ بنی قریظہ کے یہودی سپاہ عرب سے یرغمالیو کا مطالبہ کررہے ہیں تاکہ انھیں مسلمانوں کی تحویل میں دیکر لشکر اسلام کی خوشنودی حاصل کرسکیں۔ لشکر اسلام کے درمیان اس وسیع پروپگنڈہ کا مقصد یہ تھا کہ یہ بات خندق کے اس پار سپاہ عرب کے کانوں تک بھی پہونچ جائے۔

بنی قریظہ کے قلعہ میں نمایندگان قریش کی آمد:

ابو سفیان نے شنبہ کی شب میں یہ فیصلہ کیا کہ اب یہ سلسلہ ختم کیا جائے لہٰذا اس نے قریش اور قبیلہ غطفان کے کچھ سرداروں کو" بنی قریظہ کے قلعہ کی طرف روانہ کیا اور ان سے کہا کہ دیکھو! یہ علاقہ ہماری رہائش گاہ نہیں ہے اور ہمارے جانور بھی ہلاک ہوتے جارہے ہیں۔ لہٰذا تم لوگ کل پیچھے سے سپاہ اسلام پر حملہ کردو تا کہ ہم لوگ سپاہ اسلام کا کام تمام کردیں۔ قبیلہ بنی قریظہ کے سپہ سالار نے نمایندگان احزاب کو جواب دیتے ہوئے کہا۔" کل شنبہ کا دن ہے اور ہم یہودی قوم والے شنبہ کو کوئی نیا کام شروع نہیں کرتے ہیں کیونکہ ہمارے بزرگوں میں کچھ لوگوں نے شنبہ کو کوئی نیا کام شروع کیا تھا تو ان لوگوں پر عذاب الٰہی نازل ہوگیا تھا۔ اس کے علاوہ ہم لوگ محمد کے خلاف جنگ اس وقت شروع کریں گے جب احزاب کے کچھ سردار یرغمال کی حیثیت سے ہمارے قلعہ کے اندر موجود ہوں تا کہ تم لوگ اپنے بزرگوں کی نجات کی خاطر آخری دم تک جنگ کرو اور ہم لوگوں کو تنہا چھوڑ کر نہ بھاگو۔

نمایندگان قریش وہاں سے واپس آگئے اور قبیلہ بنی قریظہ نے جو کچھ کہا تھا وہ سرداران احزاب کے سامنے بیان کردیا۔ ان لوگوں نے نعیم کی ہمدردی کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ درحقیقت بنی قریظہ والے ہمارے ساتھ عیاری وحیلہ گری سے کام لینا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد قبیلہ قریش کے لوگوں نے دوبارہ بنی قریظہ کے ساتھ رابطہ قائم کیا اور کہا کہ ہم لوگوں کو تمہاری یہ شرط ہرگز قبول نہیں ہے کہ ہم اپنے سرداروں کو تمہارا یرغمال بنادیں۔ البتہ اگر تم کل حملہ کرنا چاہتے ہوتو ہم تمہاری مدد کے لئے آمادہ ہیں۔ نمایندگان احزاب کا یہ سخت لہجہ ان لوگوں کو بالکل پسند نہ آیا کہ" ہم اپنا ایک آدمی بھی یرغمال کی حیثیت سے تمہارے حوالے نہ کریں گے۔" ان لوگوں کو پوری طرح یقین ہوگیا کہ" نعیم" بالکل ٹھیک ہی کہہ رہا تھا کہ قریش مصلحت اندیشی سے کام لے رہے ہیں۔ اگر انھیں اس جنگ میں کامیابی دکھائی نہ دی تو لوگ اپنی اصلی رہائش گاہ کی طرف بھاگ کھڑے ہوں گے اور ہم لوگ سپاہ اسلام کے چنگل میں پڑے رہ جائیں گے۔" [۱۸]

آخری سبب:

مذکورہ بالا اسباب کے علاوہ ایک دوسرا سبب بھی شامل حال ہوگیا جس کو درحقیقت تائید غیبی کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا جاسکتا ہے اور جس کی وجہ سے احزاب کا متفرق ہونا یقینی ہوگیا۔ وہ دوسرا سبب یہ تھا کہ اچانک موسم طوفانی ہوگیا اور ٹھنڈک میں غیر معمولی شدت پیدا ہوگئی۔ ہوا کی تیز رفتاری کا یہ عالم تھا کہ خیمے خود بخود اپنی جگہ سے اکھڑ گئے اور چولھے پر چڑھے ہوئے کھانے کے ڈیگ جلتی ہوئی آگ پر الٹ گئے۔ سارے چراغ بجھ گئے اور جلتی ہوئی آگ پورے جنگل میں بکھر گئی۔ ایسے ماحول میں پیغمبر نے ''حزیفہ'' کو حکم دیا کہ وہ خندق کے اس پار جاکر دشمن کے بارے میں لازمی اطلاعات حاصل کریں۔ ان کا بیان ہے کہ میں تیزی سے بڑھتے ہوئے ابوسفیان کے نزدیک پہونچ گیا اور میں نے دیکھا کہ وہ اپنے سرداروں کو مخاطب کرتے ہوئے یہ تقریر کررہا تھا۔ ''دیکھو! ہم لوگ جس جگہ پر کھڑے ہوئے ہیں یہ ہماری مرکزی رہائش گاہ نہیں ہے۔ ہمارے حیوانات ہلاک ہوچکے ہیں اور طوفان وشدت ہوا کی وجہ سے ہمارے خیمہ وغیرہ بھی سلامت نہیں رہ گئے اور بنی قریظہ نے بھی ہم لوگوں کی کوئی مدد نہیں کی لہٰذا مصلحت اسی میں ہے کہ ہم لوگ یہاں سے کوچ کریں۔'' اس کے بعد وہ اپنے اونٹ پر سوار ہوکر اس پر مسلسل تازیانہ برسانے لگا۔ وہ بیچارہ اتنا خوفزدہ تھا کہ اسے یہ نہیں پتہ رہ گیا تھا کہ جس اونٹ پر وہ سوار ہے اس کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔

ابھی جس علاقے میں احزاب کا پڑاؤ تھا وہاں سفیدی سحر بھی نمودار نہیں ہوئی تھی لیکن اس علاقے سے سپاہ عرب بالکل غائب ہوچکی تھی اور انکا ایک بھی سپاہی اس جگہ باقی نہ رہ گیا تھا۔[۱] اور اس طرح ہجرت کے پانچویں سال ماہ ذی قعدہ کی چوبیسویں تاریخ کو احزاب کا یہ شور وغل پوری طرح ختم ہوگیا۔

حوالے:

۱۔ ان دو قبیلوں کا نام ہے جس نے اسلام کی تبلیغی سپاہ کو اپنے علاقے میں آنے کی دعوت دی

اور انھیں قتل کرڈالا۔

۲۔مغازہ واقدی جلد ۲ ص ۴۵۸۔۴۵۹۔

۳۔سیرۂ حلبی جلد ۲ ص ۳۳۵

۴۔سیرہ حلبی جلد ۲ ص ۳۴۰

۵۔الامتاع ص۔ ۲۴۰

۶۔ایّھا النّاس اذا.....ظلال الیسوف۔'' سیرہ حلبی جلد ۲ ص ۔۳۴۹

۷۔'' تاریخ طبری'' جلد ۲ ص ۱۲۳۹ وطبقات کبریٰ جلد ۲ ص ۔ ۶۸'' وکان علی رویھم الطیر ۔'' مغازی جلد ۲ ص ۔۴۷۰

۸۔ واقدی لکھتا ہے: جس وقت عمرو مبارزہ طلبی کررہا تھا، تمام مسلمانوں پر سکوت طاری تھا ولقد بحصت من النداء۔ بجمعکم ھل من مبارزہ۔

۹۔سورہ انبیاء آیت ۔۸۹

۱۰۔ کنز الفوائد ص ۱۳۷

۱۱۔ "لاتعجلن فقد اناک ۔ مجیب صوتک غیر عاجز ۔"

۱۲۔بحار الانوار جلد۔ ۲۰ ص ۲۲۷

۱۳۔ بحار جلد ۲ ص ۲۱۶، مستدرک حاکم جلد ۳ ص ۔ ۳۲

۱۴۔مستدرک حاکم جلد ۳ ص ۔ ۳۳

۱۵۔"واللہ لا نعطیھم الاالسیف حتی یحکم اللہ بیننا وبینھم۔"

۱۶۔سیرہ ابن ہشام جلد ۲ ص ۲۲۳، بحار جلد ۲۰ ص ۔ ۲۵۲

۱۷۔ فان الحرب خدعۃ ۔

۱۸۔سیرہ ابن ہشام جلد ۲ ص ۲۲۹ تا ۲۳۱ اور تاریخ طبری جلد ۲ ص ۔ ۲۴۲، ۲۴۳

۱۹۔تاریخ طبری جلد ۲ ص ۔ ۲۴۴

پروفیسر حکیم سید محمد کمال الدین حسین ہمدانی
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

فرھنگ وتمدن

شیخ الرئیس بوعلی سینا حیات اور خدمات

شیخ الرئیس بوعلی سینا ایک ایسی نابغہ روزگار شخصیت کے حامل تھے جو صدیوں میں پیدا ہوتی ہے۔ طبی دنیا نہ صرف شیخ الرئیس کے آثار وافکار سے متاثر رہی ہے۔ بلکہ فلسفہ طبیعات، نفسیات، تصوف واخلاقیات وادبیات وغیرہ میں انھوں نے ایسی محیر العقول تحریریں یادگار چھوڑی ہیں جو بے مثل ہیں۔ ان کی تصانیف کی تعداد مختلف علوم وفنون متداولہ پر بکثرت ہیں لیکن ان کا خاص میدان فلسفہ اور طب رہا۔ فلسفہ میں ان کی جامع شاہکار کتاب الشفاء اور علم طب میں اُن کا یادگار نامہ ''القانون فی الطب'' ہے۔

شیخ الرئیس کی مستند سوانح ان کے شاگرد رشید ابوعبید جوزجانی نے لکھی ہے جو نہایت مستند ہے اس کا اقتباس یہ ہے: شیخ الرئیس کے والد بلخ کے باشندہ تھے۔ نوح بن منصور کے عہد میں وہ بخارا منتقل ہوئے جہاں ان کو علاقہ خرمتین کی جائداد ملی۔ اس کے قریب افشنہ میں انہوں نے شادی کی اور یہیں شیخ کی ولادت ۳۷۰ھ/۹۸۰ء میں ہوئی اور وہ والد کے ساتھ بخارا آئے جہاں اساتذہ سے قرآن وادب کی تعلیم حاصل کی۔ ان کے والد اسمٰعیلیوں کا عقیدہ رکھتے تھے۔ بخارا میں جب عبد اللہ ناتلی تشریف لائے تو حصول تعلیم کے لئے ان کی جانب رجوع ہوئے اور کتاب الیاغوجی پڑھی۔ دوران تعلیم جو مسئلہ ان کے استاد بیان کرتے تھے اس سے بہتر شیخ اس کی تصویر پیش کرتے تھے جس پر ناتلی کو بہت تعجب ہوتا تھا۔ بعد ازاں شیخ نے دیگر کتب کا مطالعہ خود شروع کیا اور شروح کی مدد سے منطق میں کمال پیدا کرلیا۔ اسی طرح اقلیدس کے مسائل کو خود حل کیا۔ اسکے بعد شیخ کو علم طب کے حصول کا شوق پیدا ہوا اور اس فن

میں بھی بہت جلد کمال حاصل کرلیا حتیٰ کہ فضلائے طب بھی شیخ سے علم طب کا درس لینے لگے۔ شیخ نے فلسفۂ کلیات کے علاوہ معالجات میں بھی مہارت کامل حاصل کی اور فقہ اور دیگر علوم متداولہ کی تحصیل بھی بدرجۂ اتم کی حتیٰ کہ اٹھارہ سال کی عمر میں علوم مروجہ ومتداولہ میں مہارت حاصل کرلی۔ شیخ نے ہمسایہ ابوحسین عروضی کی فرمائش پر کتاب مجموعہ تصنیف کی اور ایک دیگر ہمسایہ ابوبکر برقی جو علم النفس کا ماہر تھا اسنے اس علم پر کتاب لکھنے کی فرمائش کی شیخ نے اس کی فرمائش پر کتاب الحاصل والمحصول تصنیف فرمائی نیز اخلاق کے موضوع پر کتاب البر والاثم کے نام سے لکھی۔ اس کے بعد شیخ کے والد کا انتقال ہوگیا اور حالات تبدیل ہوئے اور سلطنت کے کاموں کی ذمہ داری بھی شیخ کو سنبھالنے کے لئے بخارا چھوڑکر کالج منتقل ہونا پڑا۔ یہاں ابو الحسن سہلی وزیر تھا جو علوم کا دلدادہ تھا اس نے حکومت سے شیخ کا مشاہرہ بقدرضرورت مقرر کردیا اس کے بعد شیخ کو جرجان جانا پڑا۔ اور وہاں سے دہستان گئے جہاں سخت بیمار ہوئے پھر جرجان واپس آگئے۔ یہاں شیخ نے ایک قصیدہ لکھا جس کا مطلع یہ تھا۔

لما عظمت فلیس مصر واسعی

لما غلا ثمنی عدمت المشتری

جب عظمت کی بلندیوں پر بیٹھا تو کسی شہر کے اندر گنجائش نہ ملی، قیمت گران ہوئی تو کوئی خریدار نہ رہا۔ جرجان میں ابومحمد شیرازی شیخ الرئیس کے علوم کا قدردان تھا۔ اسنے شیخ کو ایک مکان خرید کر دیا جہاں وہ فروکش ہوئے اور ان سے مختبطی پڑھی اور انہی کے لئے شیخ نے کتاب المبداء والمعاد اور کتاب والارصاد الکلیہ لکھی۔ اور القانون فی الطب کی پہلی جلد کلیات قانون بھی تصنیف کی اور متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ کتاب الشفاء فلسفہ طبیعات ومابعد الطبعیات والٰہیات پر اٹھارہ جلدوں میں القانون چودہ جلدوں میں کتاب النجاۃ کی تین جلدیں الہدایہ ایک جلد کتاب المباحث ایک جلد، عقائد میں کتاب الاشارات جس کی شرح (شرح کتاب الاشارات) محقق طوسی نے لکھی اور متعدد رسائل مختلف موضوعات پر تصنیف فرمائے۔

شیخ پھر ری تشریف لے گئے اور وہاں صاحبزادہ مجد الدولہ کی خدمت میں مشرف ہوئے یہاں آپ نے کتاب المعاد تصنیف فرمائی اس کے بعد شمس الدولہ نے ان کی تعریف سنی تو شیخ کو طلب کیا۔ علاج معالجہ سے اسے شفاء ہوئی تو شیخ کو خلعتوں سے سرفراز کر کے رخصت کیا اور شیخ ہمدان پہنچے جہاں ارکان سلطنت نے آپ کو وزارت کا عہدہ پیش کیا جسے آپ نے منظور فرمایا مگر فوج میں ان کے خلاف بغاوت پیدا ہوگئی تو فوج نے آپ کا تمام اسباب وسامان ضبط کرلیا اور آپ کو مقید کردیا۔ امیر سے آپ کے قتل کا مطالبہ بھی ہوا مگر اس نے منظور نہ کیا البتہ فوج کی منشا کے مطابق آپ کو جلاوطن کردینے پر اکتفا کیا۔ اتفاقاً شمس الدولہ کو قولنج کی شکایت دوبارہ لاحق ہوئی تو شیخ کو طلب کیا اور ہر طرح کی معذرت کی۔ آپ نے اس کا علاج کیا اور قدر ومنزلت کا اعزاز شیخ کو ملا وزارت دوبارہ سپرد کی گئی اس کے بعد آپ نے کتاب الشفاء لکھی جو طبعیات پر معرکہ کی کتاب ثابت ہوئی۔ شفاء سے فراغت کے بعد آپ نے القانون فی الطب کی تکمیل کی۔ اسی دوران تاج الملک نے آپ پر علاء الدولہ سے مراسلت کا الزام بھی لگایا۔ آپ کی مذمت کی اور آپ کو گرفتار کر کے فرد جان نامی قلعہ میں نظر بند کردیا۔ اس کے بعد علاء الدولہ نے حملہ کر کے ہمدان فتح کرلیا۔ تاج الملک نے شکست کھائی بعد ازاں علاء الدولہ نے ہمدان سے رجعت کی لیکن کچھ عرصہ بعد شیخ کو قلعہ فرد جان سے نکالکر اپنے ساتھ ہی ہمدان واپس لائے اور شیخ ہمدان میں شیخ علوی کے گھر فروکش ہوئے اور یہاں کتاب الشفاء کے جزو منطق کی تکمیل میں مصروف رہے۔

پھر شیخ نے اصفہان رحلت کرنے کا عزم کیا۔ راستے کی صعوبتوں کو اٹھا کر اصفہان پہنچے تو شیخ کے دوستوں اور نصیر الدولہ کے ندیموں اور خواص نے شیخ اور ان کے بھائی اور دو غلاموں کا شاندار استقبال کیا اور آپ کو، کوکبند نامی محلہ کے اندر عبد اللہ بن بابی کے گھر مہمان رکھا۔

جب علاء الدولہ نے باب الکرخ پر حملہ کیا تو شیخ علاء الدولہ کے ہمرکاب تھے اسی

سفر میں شیخ کو قولنج لاحق ہوا کسی علاج سے شفاء نہ ہوئی آخر ثمر ودبطوس استعمال کیا۔ کسی خادم نے ثمر ودبطوس میں افیون زیادہ ملادی جس سے قبض بے انتہا بڑھ گیا اور شیخ اسی حالت میں اصفہان واپس ہوئے اور پھر ہمدان پہنچے۔ ہمدان پہنچ کر اس کی قوت مدافعت اس قابل نہ رہی کہ دفع مرض کرسکتے۔ پس شیخ نے علاج ترک کیا اور خیرات اور ذکر الٰہی کا سلسلہ جاری کیا۔ اسی حالت میں جمعہ کے روز رمضان ۴۲۸ھ رجون ۱۰۳۷ء میں وفات پائی اور انکا دفن ہمدان کی شہر پناہ کی قبلہ رخ دیوار کے متصل واقع ہوا۔ بلند گنبد دار مقبرہ اُن کی قبر پر تعمیر کیا گیا جس سے متصل ان کا مجسمہ بھی نصب کیا گیا جو زیارت گاہ خواص وعوام ہے اور راقم سطور بھی اس کے مقبرہ کی زیارت سے ۲۲ ستمبر ۲۰۰۴ء کو ہمائش بین المللی بوعلی سینا ہمدان کے دوران شرف یاب ہوچکا ہے۔

شیخ الرئیس صاحب تصانیف کثیرہ ہیں لیکن ان کی کچھ کتابیں بہت مشہور ہوئیں۔ فلسفہ میں کتاب الشفاء اور طب میں القانون فی الطب اور احکام ادویہ قلبیہ اور عقائد میں کتاب اشارات بہت مشہور ہیں۔ کتاب الشفاء شیخ نے فلسفۂ طبیعات پر ہمدان میں لکھنا شروع کی جب ان کو ہمدان کی وزارت پر دوبارہ شمس الدولہ نے سرفراز کیا۔ شمس الدولہ کی وفات کے بعد علاء الدولہ سے مراسلت کی اور اس کی مصاحبین میں شمولیت کی خواہش ظاہر کی اور وہ شیخ ابو غالب عطار کے مکان میں روپوش ہوئے۔ اس عرصے میں ابوعبید جوزجانی نے کتاب الشفاء کی تکمیل کی فرمائش کی۔ چنانچہ شیخ نے آٹھ آٹھ صفحات کے تقریباً بیس اجزاء اپنے قلم سے بنیادی مسائل پر تحریر کئے اور اپنی یادداشت اور حافظہ سے کام لے کر یہ کارنامہ انجام دیا۔ چنانچہ شیخ پچاس ورق روز تحریر فرماتے رہے حتیٰ کہ کتاب الحیوان اور کتاب النباتات کو چھوڑ کر طبیعات والٰہیات کے تمام مباحث قلمبند فرمادئے۔ منطق کی ابتداء کی اور اس کا بھی ایک جزو تحریر کیا۔ اسی اثناء میں تاج الملک نے آپ پر علاء الدولہ سے مراسلت کا الزام لگایا اور اس جرم میں آپ کو قلع فردجان میں نظر بند کردیا گیا۔ اس کے بعد علاء الدولہ نے حملہ کرکے ہمدان پر قبضہ کرلیا

اور ہمدان رجعت کی اور شیخ کو بھی قلعہ سے آزاد کرا دیا اور شیخ ہمدان میں شیخ علوی کے مکان میں فروکش ہوئے اور کتاب الشفاء کا منطق کا حصہ تصنیف فرمایا پھر اصفہان میں کتاب الشفاء کی تکمیل فرمائی کتاب الحیوان اور کتاب النباتات کی تصنیف بھی مکمل فرمائی۔

القانون فی الطب ۔علم طب پر شیخ الرئیس نے ایک جامع کتاب القانون فی الطب تصنیف فرمائی جس نے طلبا کی علم طب کو دیگر طبی کتب کے مطالعے سے بے نیاز کر دیا۔ یہ کتاب مدارس طبیہ میں بہت مقبول ہوئی۔

شیخ الرئیس نے القانون فی الطب جرجان میں لکھنا شروع کی اور رے میں اس کی تکمیل کی۔ یہ علم طب کے پانچ شعبوں پر حاوی ہے۔

جلد اول: امور کلیہ طب یہ جلد تشریح، حفظ صحت، ماہیت مرض ،نبض وبول وبراز، کلیات ادویہ اور کلیات علاج پر حاوی ہے۔

جلد دوم: ادویہ مفردہ پر حاوی ہے اس میں مفرد دواؤں کا نام وماہیت اور مزاج اور افعال وخواص بیان کئے ہیں۔

جلد سوم: مخصوص امراء جسمانی کے ذکر پر مشتمل ہے اس میں اعضاء کی تشریح کے ساتھ ان کے امراض کا علاج بیان کیا ہے۔

جلد چہارم: امراض عامہ اور حمیات سے متعلق ہے۔

جلد پنجم: قرابادین ہے۔

شیخ الرئیس نے علم طب کے جملہ شعبوں کو القانون میں بڑی حکمت کے ساتھ مدون کر دیا ہے۔ یہ کتاب نہ صرف ایران میں مقبول ہوئی بلکہ مغرب میں بھی درسیات طب کے لئے منتخب کی گئی۔ شیخ الرئیس مغرب میں اس وقت بحیثیت ماہر طبیب مشہور ہوئے جب جیرا رڈ آف کریمونا (۱۱۱۴ء تا ۱۱۸۷ء) نے لاطینی زبان میں میڈیکل اسکولوں میں اس کی تعلیم کے لئے ترجمہ کیا۔ اس ترجمہ میں شیخ الرئیس ابو علی سینا کو Avicenna کے نام سے پیش کیا۔ یہ

ترجمہ یورپی ممالک میں بہت مقبول ہوا اور یورپی اسکولوں مین سولہویں صدی عیسوی تک داخل درس رہا۔ جیرار ڈآف کریمونا نے القانون کا یہ ترجمہ ٹولیڈو کے دار المترجمہ میں کیا جو اسپین کا مشہور شہر ہے۔

القانون فی الطب کا مکمل اردو ترجمہ ہندوستان میں علامہ حکیم مولوی سید غلام حسین کنتوری نے کیا تھا جو مطبع منشی نولکشور لکھنؤ سے ۱۲۱۴ھ مطابق ۱۸۹۶ء پانچ جلدوں میں شائع ہوا۔

کلیات قانون کا ترجمہ بزبان فارسی حکیم فتح اللہ گیلانی نے ۱۰۰۲ھ/ ۱۵۹۳ء میں کیا جو مطبع منشی نولکشور لکھنؤ سے ۱۸۸۹ء میں شائع ہوا ادارہ تاریخ وتحقیق طب جامعہ ہمدرد ہمدرد نگر دہلی میں موجود ہے۔

ترجمہ وشروح کلیات قانون بزبان اردو اصل متن کے ساتھ حکیم محمد اکبر الدین نے دفتر المسیح قرول باغ دہلی نے شائع کیا۔ حصہ اول ۱۳۴۹ھ/ ۱۹۲۰ء میں اور حصہ دوم ۱۳۵۱ھ/ ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا۔

ترجمہ وشرح کلیات قانون بزبان اردو حکیم خواجہ رضوان احمد پرنسپل طبیہ کالج سلہٹ نے دار التالیفات دہلی سے شائع کیا۔

یہ دونوں اردو تراجم ہندوستان کے طبیہ کالجوں کے نصاب تعلیم میں شامل رہے۔

راقم سطور نے کلیات قانون کا خلاصہ طبیہ کالج کے نصاب تعلیم کے مطابق تالیف کیا۔ یہ خلاصہ اصول طب کے عنوان سے قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو، نئی دہلی اپریل تا جون ۱۹۹۸ء میں شائع کیا جو ڈائریکٹر قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو ویسٹ بلاک ۱ آر کے پورم نئی دہلی ۔۱۱۰۰۶۶ سے دستیاب ہے۔ یہ خلاصہ ہندوستان کے طبیہ کالجوں میں مقبول ہوا۔ عام طور پر طلباء نے اس کتاب سے استفادہ کیا ہے۔

قانون کے خلاصے جو اطبائے قدیم نے کئے تھے ان میں قانونچہ مولفہ شمس الدین

محمد بن محمود الجغمینی نے بزبان عربی کیا۔ طب کے مبتدیوں کو اولاً یہی پڑھایا جاتا تھا۔ اس کا اردو ترجمہ حکیم محمد کبیر الدین صاحب دفتر المسیح قرولباغ دہلی سے شائع کیا۔ دوسرا خلاصہ موجز القانون مولفہ علاء الدین ابن الحزم القرشی (متوفی ۶۸۸ھ/ ۱۲۸۸ء) نے کیا۔ اس کا اردو ترجمہ حکیم کوثر چاندپوری نے ترقی اردو بیوروئی دہلی سے ۱۹۸۴ء میں شائع کرایا۔ تیسرا خلاصہ نفیس شرح موجز القانون برہان الدین نفیس ابن عوض ابن جمال الدین حکیم المطبب کرمانی نے سمرقند میں تالیف کیا۔ چوتھا خلاصہ سدیدی مولفہ شیخ سدیدالدین گاذرونی متوفی (۶۹ےھ/ ۱۳۶۹ء) کو رحمن بخش نے کلکتہ سے ۱۸۲۸ء میں شائع کیا۔ پانچواں خلاصہ قسرائی مولفہ جمال الدین متوفی (۸۳۷ھ/ ۱۴۳۳ء) بزبان عربی۔ یہ کتاب مطبع منشی نول کشور سے تین جلدوں میں بار ہفتم ۱۹۰۷ء میں شائع ہوئی۔ یہ پانچ خلاصہ بہت مشہور رہوئے۔ اور درسیات طب میں شامل رہے ان کے علاوہ دیگر اطباء نے بھی خلاصے لکھے جن کی تفصیل زیر تحقیق ہے۔ پھر ان خلاصوں کی شروح بھی لکھی گئیں اور القانون فی الطب کے حواشی بھی بکثرت لکھے گئے جو ابھی تحقیق طلب ہیں۔ غرضکہ القانون پر اطباء نے اس قدر توجہ دی کہ کسی دیگر طبی کتاب پر اتنی توجہ نہ دی گئی۔ القانون فی الطب کی شرحین بھی بکثرت لکھی گئی ہیں لیکن جامع الشرحیں یعنی شرح قانون محمود آملی اور علی حسین گیلانی زیادہ مشہور ہوئی اور اس کو بعنوان جامع الشرحین ۱۲۶۷ھ/ ۱۸۵۰ء مطبع محمد حسن لکھنؤ سے شائع کیا گیا۔ رضا لائبریری رامپور میں اس شرح کا دسویں صدی ہجری کا مخطوطہ موجود ہے۔ پروفیسر حکیم سید ظل الرحمٰن نے کتاب قانون ابن مینا شارحان و ترجمان لکھی جس کا ترجمہ بزبان فارسی سید عبد القادر ہاشمی نے کیا ہے۔ ترجمہ انجمن آثار مفاخر فرہنگی، ایران نے ۲۰۰۴ء میں شائع کیا ہے۔

شیخ الرئیس نے القانون فی الطب کی جلد سوم معالجات انسانی پر لکھی یہ کتاب بھی مستند قرار پائی مدارس طبیہ میں داخل درس رہی۔ شرح القانون مکمل علاء الدین علی ابن ابی الحرم القرشی الشافعی المعروف بہ ابن نفیس (متوفی ۶۸۷ھ/ ۱۲۸۸ء) نے لکھی تھی۔ اس شرح کی طبی

دنیا میں بہت پذیرائی ہوئی۔ مسیح الملک حکیم اجمل خاں (متوفی ۱۹۲۷ء) اس شرح کے بڑے مداح تھے۔ ان کا خیال تھا کہ گیلانی نے قانون کی اس شرح میں ہر عضو کی تشریح کر کے آخر میں بہت سادہ امراض اسباب، علامات ومعالجات اپنی طرف سے اضافہ کئے ہیں جنہیں شیخ نے نہیں لکھا۔ اس شرح کا سب سے اہم اور وقیع پانچ جلدوں پر مشتمل نسخہ رضا لائبریری رامپور میں موجود ہے۔ حاشیہ پر مصنف (شارح) کے قلم کی عبارتیں اس بات کی غماز ہیں کہ یہ نسخہ مصنف کے مطالعہ میں رہا ہے۔ القانون فی الطب جلد سوم کے حواشی بھی اطبائے قدیم نے لکھے ہیں جو بکثرت ہیں اور ان کی جامع فہرست تشنہ تحقیق ہے۔ کچھ تفصیل جہان طب، ابن سینا نمبر شائع کردہ سینٹرل کونسل فار ریسرچ یونانی میڈیسن منسٹری آف ہیلتھ اینڈ فیملی ویلفیئر گورنمنٹ آف انڈیا میں دیکھی جاسکتی ہے اور کچھ کتاب شارحان قانون ابن سینا وتراجم آن" میں ملتی ہے لیکن کتاب خانہ ادارہ ہمدانیہ جلالی ضلع علی گڑھ میں معالجات القانون کا ایک نادر مخطوطہ مخشی موجود ہے جس کا ذکر مذکورہ بالا کتاب یا ابن سینا نمبر جہان طب میں بھی نہیں ہے۔ اس مخطوطہ پر حکیم سید علی اصغر خان ابن حکیم سید عسکری خاں ابن سید صداقت علی خاں مازندرانی کے دستخط ہیں جس سے واضح ہوتا ہے کہ اس مازندرانی خاندان اطباء کے مطالعہ میں یہ مخطوطہ رہا ہے اسکے کاتب عبدالعلی ہیں اور اسکی کتابت یوم الجمعہ شہر جمادی الثانی سن ثمث جلوس شاہ عالم سلطان الہند ہے۔ پانچ سو اٹھائیس صفحات پر یہ مخطوطہ تحریر ہے۔ جملہ امراض جسمانی کے معالجات اس میں بیان کئے گئے ہیں اور اکثر امراض کو اضافات کے ساتھ مخشی کیا گیا ہے۔

احکام ادویۂ قلبیہ:

شیخ الرئیس بوعلی سینا نے معالجات قانون کے علاوہ امراض قلب پر ایک جداگانہ رسالہ احکام ادویۃ القلبیہ تصنیف کیا ہے۔ اس بنا پر کہ قلب انسانی چونکہ مرکز روح ونفس بھی ہے اس لحاظ سے امراض قلبیہ پر ایک جداگانہ کتاب کی ضرورت درپیش تھی۔ چنانچہ شیخ الرئیس نے احکام الادویۃ القلبیہ نام کا ایک رسالہ جداگانہ تصنیف کیا اور اس میں نفسیات کا

ڈائرا طب سے ملایا۔ شفاء الملک حکیم عبد اللطیف صاحب پرنسپل طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ احکام ادویۃ القلبیہ کا ترجمہ بزبان اردو فرما کر ایران سوسائٹی کلکتہ سے ۱۹۵۶ء میں شائع کرایا۔

شفاء الملک حکیم عبد اللطیف صاحب پرنسپل طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اپنی رائے پیش فرماتے ہوئے تحریر کرتے ہیں۔ ''میرے نزدیک شیخ الرئیس کی کتاب الادویۃ القلبیہ اسکی ذاتی تحقیق پر مشتمل ہے متقدمین اور متاخرین نے بے شمار کتابیں تصنیف کیں لیکن شیخ الرئیس نے ادویہ قلبیہ میں ہی نفسانی امراض وصفات کی توضیح اور طبی تدابیر پیش کیں۔ جس سے قبل کسی طبیب نے پیش نہیں کیا۔ شیخ الرئیس پہلا حکیم ہے جس نے سائیکلوجی (علم نفسیات) کا تعلق علم طب سے ثابت کیا ہے۔ خیر وشر، لذت والم، نفرت ومحبت، کینہ وعداوت، بغض وحسد غیض وغضب، ذکاوت وبلادت تمام امراض نفسانیہ کا مرکز قلب کو قرار دیا ہے اور اس کی ساخت اور اس کے مختلف قسم کے رطوبات اور اخلاط کو نفسانی کیفیات کا سبب قرار دیا ہے۔ جس کی اصلاح اور علاج ایک ماہر طبیب ہی کرسکتا ہے۔

غرضیکہ شیخ الرئیس پہلا حکیم ہے جس نے جسم کے مادی اور روحانی علاج سے بحث کی ہے اور روحانی ونفسانی امراض کا علاج بھی ادویہ سے تجویز کیا اور یہ تحقیق اس کو جملہ اطباء پر فوقیت دیتی ہے اور اطبا قدیم میں اس کو ممتاز قرار دیتی ہے۔

مذہب شیخ الرئیس کا خاندان فرقہ اسمٰعیلیہ باطنیہ سے تعلق رکھتا تھا۔ عہد اکبری کے قاضی القضات علامہ سید نور الدین شوستری علیہ الرحمہ نے مجالس المومنین میں شیخ کا تشیع ثابت کیا ہے۔ محقق طوسی علیہ الرحمہ نے شیخ الرئیس کی تصنیف اشارات کی شرح لکھی جو عقائد مذہب شیعہ کی ایک مستند کتاب ہے۔

شیخ الرئیس موحد تھا۔ حضرت رسول خداؐ واحکام رسولؐ خدا کا ان کے دل میں بڑا وقار تھا۔ اُس نے اپنے دوست صوفی ابو سعید ابی الخیر کو عقائد کے سلسلہ میں ایک خط لکھا تھا جس کا

اقتباس ملاحظہ ہو۔تمہارے ظاہر وباطن اور اول وآخر صرف اللہ کی طرف ہونا چاہئے۔ تمہارے نفس کی آنکھ صفات باری کو دیکھ کر شرمگین ہونی چاہئے۔ نیز کبھی کبھی تم اپنے نفس کو ذہنی طور پر عالم ملکوت کی سیر بھی کرادیا کرو اور ان نشانیوں اور علامات پر بھی نفس کو غور کرادیا کرو جو عالم ملکوت میں وجود باری کے متعلق موجود ہیں۔ پھر جب تمہارا نفس اصلی مرکز سے نیچے آیا کرے تو اس کو یہ بھی بتلایا کرو کہ اللہ پاک بے عیب ہے جو پوشیدہ بھی ہے اور ظاہر بھی وہ ہر شے میں جلوہ گر ہے اور ہر شئے سے اس کا نور نمایاں ہے وفی کل شئی لہ آئینہ تدل علی انہ واحد۔

ہر شئے میں خدا ہی کا ظہور ہے اور یہ اس امر کو واضح کرتا ہے کہ اللہ ایک ہے۔

جب تمہارے نفس میں ان باتوں کے سمجھنے کا ملکہ ہوجائے گا اور اس میں عالم ملکوت کے نقوش ظاہر ہوجائیں گے تو عالم لاہوت (عالم مقدس) تم پر ظاہر ہونے لگے گا اور پھر نفس خود اس بات کا فیصلہ کرے گا کہ میرے نفس کا زیادہ مستحق کون ہے۔ ان مدارج کے حاصل ہونے کے بعد تم کو اطمینان اور تسکین ہوگی۔

تم کو یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ تمام افعال میں بہتر فعل نماز ہے اور سب سے زیادہ سکون بخش چیز روزہ ہے۔ اس طرح صدقہ تمام نیکیوں سے زیادہ مفید نیکی ہے اور ریا تمہارے تمام اعمال کو ضائع وبرباد کرنے والی چیز ہے۔ بہتر عمل وہ ہے جو خلوص نیت سے کیا جائے اور بہتر نیت وہ ہے جو مرکز علم سے پیدا ہو۔ یاد رکھو حکمت فضائل کی جڑ ہے اور اللہ تعالیٰ کی معرفت سب چیزوں سے مقدم ہے۔ اللہ کے نزدیک کلمات خیر ہی قابل سماعت ہیں اور اچھے اعمال ہی قابل قبول ہیں۔

مخالفین نے شیخ الرئیس کو جب کافر کہا تو شیخ نے حسب ذیل اشعار کہے۔

کفر چو منے گزاف آسان نبود
محکم تر ایمان من ایمان نبود

(ترجمہ) مجھ جیسے آدمی سے کفر سرزد ہونا آسان بات نہیں ہے۔ اور میرے ایمان سے زیادہ پختہ ایمان کسی کا نہیں ہوسکتا۔

در دہر چومن یکے وآن ہم کافر

پس در ہمہ دہر یک مسلمان نبود

اس دنیا میں مجھ جیسے پختہ ایمان والے بھی اگر کافر ہیں تو پھر دنیا میں ایک بھی مسلمان نہ ملے گا۔

مصادر:

۱۔ اردو ترجمہ عیون الانباء فی طبقات الاطباء جلد دوم۔ ناشر سینٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن، وزارت صحت وخاندانی بہبود، حکومت ہند، نئی دہلی۔

۲۔ سوانح شیخ الرئیس ابن سینا، عباس محمود العقاد، مطبوعہ دار المعارف المطابعہ والنشر بمصر۔

۳۔ ترجمہ اردو ادویہ قلبیہ مصنفہ شیخ الرئیس بو علی سینا مترجمہ اردو شفاء الملک حکیم عبد اللطیف۔ شائع کردہ ایران سوسائٹی کلکتہ ۱۹۵۶ء

۴۔ جہان طب، ابن سینا نمبر جلد ۲ اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۰۰ء شمارہ ۲۵، ناشر مرکز کونسل برائے تحقیقات یونانی وزارت خاندان بہبود، حکومت ہند، نئی دہلی۔

۵۔ سائرل ایلگڈ Cyril Elgyod ایران کی طبی تاریخ اور مشرقی خلفاء۔

۶۔ اسلامی طب شاہانہ سرپرستیوں میں مولفہ ابن مظہر قاضی معین الدین رہبر فاروقی، ناشر مکتبہ عین العلوم حیدر آباد دکن ۱۹۹۹ء/ ۱۴۲۰ھ۔

۷۔ القانون فی الطب مصنفہ شیخ الرئیس ابو علی سینا مترجمہ اردو از علامہ حکیم مولوی سید غلام حسنین کنتوری مطبوعہ مطبع منشی نول کشور لکھنو ۱۳۰۳ھ۔

۸۔ مجالس المومنین۔علامہ قاضی سید نور اللہ شوستری علیہ الرحمہ بزبان فارسی۔

۹۔ اصول طب۔ پروفیسر حکیم سید محمد کمال الدین حسین ہمدانی۔

۱۰۔ حقائق الکلیات مزاج واخلاط ۔ پروفیسر حکیم سید محمد کمال الدین حسین ہمدانی۔
۱۱۔ کتابیات کلیات، پروفیسر حکیم سید محمد کمال الدین حسین ہمدانی۔
۱۲۔ فرہنگ ہمدان، فصلنامہ پژوھشی فرہنگی ادارہ کل فرھنگ وارشاد اسلامی استان ہمدان سال دہم ،شمارہ ۳۴ سال ۱۳۸۳ ویژہ نامہ ہمایش بین المللی بوعلی سینا مدیر مسول یوسف شاہ حسینی۔

خانم نکہت فاطمہ

فرہنگ وتمدن:

شیخ الشیوخ حضرت شاہ غلام علیؒ

حضرت شاہ غلام علی دہلویؒ کا شمار ان اکابر اولیاء میں ہوتا ہے جنہوں نے مسلمانان پاک وہند کی مذہبی، معاشرتی اور سیاسی تاریخ میں اپنی سیرت وکردار کے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ دہلی اور اس کے اطراف میں انیسویں صدی کے ربع اول میں عوام کی رشد وہدایت اور تعمیر ملت کا اہم فریضہ جس انہماک، خلوص اور اہتمام سے شاہ غلام علی نے انجام دیا ہے اس کی مثال مسلمانان پاک وہند کی تاریخ میں خال خال ہی نظر آتی ہے۔

شاہ غلام علی کی ولادت ۱۱۵۶ھ/ ۱۷۴۵ء میں قصبہ بٹالہ، ضلع پنجاب میں ہوئی۔ آپ علوی سادات میں سے تھے اور آپ کا سلسلہ نسب حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔آپ کے والد بزرگوار شاہ عبد اللطیف، حضرت شاہ ناصر الدین قادری سے بیعت تھے اور انکا قیام زیادہ تر دہلی میں رہتا تھا۔

والد نے آپ کا نام علی، والدہ نے عبد القادر اور چچا نے عبد اللہ رکھا۔آپ اپنی تالیفات میں اپنا نام "فقیر عبد اللہ عرف غلام علی" لکھتے ہیں۔لیکن عوام وخواص میں آپ کی شہرت "حضرت شاہ غلام علی دہلوی" کے اسم گرامی سے ہے۔شاہ غلام علی ضمیمہ مقامات مظہری میں لکھتے ہیں کہ آپ کے والد نے اپنے پیر سے بیعت کرانے کے لئے آپ کو بٹالہ سے دہلی میں طلب کیا۔آپ روز شنبہ ۱۱ رجب ۱۱۷۴ھ/ ۱۷۶۱ء کو دہلی پہنچے۔لیکن اتفاق سے اسی روز شاہ ناصر الدینؒ کا انتقال ہوگیا۔آپ کے والد نے فرمایا کہ ہم نے تمہیں اپنے پیر سے بیعت کے لئے طلب کیا تھا۔لیکن خدا کی مرضی نہیں تھی۔ اب تم جہاں چاہو بیعت کرو۔

شاہ غلام علی نے ۴ سال تک مختلف بزرگوں مثلاً حضرت شاہ ضیاء اللہؒ، شاہ عبد

العدلؒ ، خواجہ میر دردؒ شاہ فخر الدینؒ ، شاہ نانوا اور شاہ غلام سادات چشتی سے استفادہ کیا۔ انہوں نے حدیث کی سند شاہ عبد العزیز محدث دہلوی سے لی اور بخاری شریف بھی انہی سے پڑھی۔

۱۱۸۰ھ/ ۱۷۶۶ء میں وہ حضرت شمس الدین حبیب اللہ المعروف بہ مرزا مظہر جانجاناںؒ کی خدمت میں پہنچے اور ان سے بیعت کی۔ شاہ غلام علی ۱۵ سال تک مرزا مظہر کی مجلس ذکر اور حلقہ میں بیٹھے اور ان کی خصوصی توجہ سے سلوک کی منازل طے کیں اور اپنے مرشد کی شہادت ۱۱۹۵ھ/ ۱۷۸۰ء تک خانقاہ مظہری کی خدمت میں خلوص سے مصروف رہے۔ حضرت مظہر کی شہادت کے بعد شاہ غلام مسند ارشاد پر رونق افروز ہوئے۔ اس کے بعد طالبان خدا کی تعلیم وتربیت میں مصروف ہوگئے اور مرزا جانجاناں کی خانقاہ کو آباد رکھا۔

آپ کی ذات سے تمام جہاں میں فیض پھیلا اور مختلف ممالک کے لوگوں نے آخر بیعت اختیار کی۔ جامع ملفوظات حضرت شاہ عبد الرؤف مجددی ''درالمعارف'' میں لکھتے ہیں:

''نہ صرف ہندوستان میں بلکہ عالم اسلام کے طالبان حق آپ کے حلقہ بگوش تھے۔ آپ کی خانقاہ میں سمرقند، بخارا، غزنی ، تاشقند، حصار قندھار، کابل ، پیشاور، ملتان ، کشمیر، لاہور، سرہند، امروہہ ، سنبھل ، بریلی ، رام پور، لکھنؤ ، جائس، بہرائچ، گورکھپور، عظیم آباد، ڈھاکہ، بنگالہ، حیدر آباد اور پونا کے باشندے آتے تھے۔''

سر سید احمد خان آثار الصنادید میں رقم طراز ہیں:

''میں نے حضرت کی خانقاہ میں اپنی آنکھ سے روم ، شام ، بغداد، مصر، چین اور حبش کے لوگوں کو دیکھا ہے کہ حاضر ہوکر بیعت کی اور خدمات خانقاہ کو سعادت ابدی سمجھا اور قریب قریب کے شہروں کا مثل ہندوستان ، پنجاب اور افغانستان کا تو کچھ ذکر نہیں کہ لوگ ٹڈی دل کی طرح امنڈتے تھے۔''[۲]

بادشاہ اور امراء خانقاہ کے اخراجات کے لئے مدد کے طور پر کچھ دینے کی خواہش کرتے تو آپ ان کی درخواست رد فرما دیتے۔ آپ کی زبان مبارک پر ہمیشہ یہ قطعہ رہتا:

خاک نشینی است سلیمانیم
عار بود افسر سلطانیم
ہست چہل سال کہ می پوشمش
کہنہ نہ شد خلعت عریانیم[۴]

نواب ٹونک امیر خان نے خانقاہ کے خرچ کے لئے رقم مقرر کرنے کی خواہش ظاہر کی لیکن آپ نے قبول نہیں فرمائی اور شاہ رؤف احمد صاحب سے یہ شعر لکھ کر بھیجنے کے لئے کہا:

ما آبروی فقر وقناعت نمی بریم
بہ امیر خاں بگوی کہ روزی مقدر است[۵]

آپ فرماتے ہیں کہ خانقاہ کے اخراجات غیب سے پورے ہوتے ہیں۔ سر سید احمد جن کا بچپن شاہ غلام علیؒ کی خانقاہ میں گذرا تھا لکھتے ہیں:

"حضرت کی خانقاہ میں پانچ سو فقیر سے کم نہیں رہتے تھے اور سب کا روٹی کپڑا آپ کے ذمہ تھا باوجودیکہ کہیں سے ایک حبہ مقرر نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ غیب الغیب سے سب کام چلاتا تھا۔ اس پر فیاضی اور سخاوت اس قدر تھی کہ کبھی سایل کو محروم نہیں پھیرا جو اس نے مانگا وہی دیا۔"[۵]

آپ کو جناب سرورکائناتؐ کے ساتھ عشق کا مرتبہ حاصل تھا جب آپ حضورؐ کا نام لیتے تو بیتاب ہوجاتے۔ ایک مرتبہ آپ کا خادم قدم شریف سے پانی کا تبرک لایا اور کہا کہ حضرت رسولؐ خدا کا آپ پر سایہ ہو۔ یہ بات سنتے ہی آپ بیتاب ہوگئے اور اس خادم کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ فرمایا کہ میری ہستی ہی کیا کہ مجھ پر حضرت رسولؐ کا سایہ مبارک ہو۔ اور اس خادم پر بہت نوازش کی۔[۶]

آپ کے اوقات شریف نہایت منضبط تھے۔ قرآن شریف حفظ تھا۔ صبح کی نماز اول

وقت میں جماعت کے ساتھ ادا کر کے اشراق تک حلقہ و مراقبہ ہوتا۔ اس کے بعد طالب علموں کو حدیث اور تفسیر کا درس دیتے۔ زوال کے قریب تھوڑا سا کھانا کھا کر قیلولہ فرماتے اور پھر دینی کتب کا مطالعہ اور ضروری تحریرات میں مشغول ہو جاتے۔ عصر کی نماز پڑھتے اور پھر حدیث اور تصوف کی کتابیں پڑھاتے اور شام تک حلقہ ذکر اور توجہ میں مشغول رہتے۔ شام کی نماز کے بعد خاص مریدوں کی طرف توجہ دیتے۔ کھانا کھا کر عشاء کی نماز پڑھتے۔ رات اکثر بیٹھ کر ذکر اور مراقبہ میں گزارتے تھے۔ بہت کم سوتے تھے۔ اگر تہجد کے وقت لوگوں کو خواب غفلت میں پاتے تو انہیں بیدار کرتے تھے۔ خود تہجد کی نماز پڑھتے اور پھر مراقبہ اور تلاوت کلام پاک میں مشغول ہو جاتے۔

خود موٹا لباس پہننے کی عادت تھی اگر کوئی نفیس لباس بھیجتا تو اسے بیچ کر کئی کپڑے خریدتے اور انہیں صدقہ میں دے دیتے۔ کسی کے گھر کا کھانا نہیں کھاتے تھے۔ اگر ان کے کسی معتقد کے گھر سے کھانا آتا تو اسے محتاجوں میں تقسیم فرما دیتے تھے۔ دنیا کے ذکر کی آپ کی مجلس میں کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اگر کوئی کسی کی غیبت کرتا تو فرماتے تھے کہ کسی کو برائی سے یاد کرنا ہی ہے تو میں سب سے زیادہ اس کا مستحق ہوں۔

سر سید احمد خان کی تربیت آپ کی گود میں ہوئی تھی۔ آثار الصنادید میں ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

''حق یہ ہے کہ ایسا برشتہ جان شیخ دیکھنے میں نہیں آیا اور میں تو اس بات پر عاشق ہوں کہ باوجود اتنی آزادی اور خود فنگی سر مو احکام شریعت سے تجاوز نہ تھا اور جو کام تھا وہ باتباع سنت تھا۔ لقمہ مشتبہ سے پرہیز کرتے اور مال مشتبہ ہرگز نہ لیتے۔ جو شخص خلاف شرع اور سنت ہوتا اس سے نہایت خفا ہوتے اور اپنے پاس اس کا آنا گوارا نہ کرتے۔''[۷]

آپ کے دست مبارک پر بیعت کرنے والوں کا کوئی شمار ہی نہیں ہے۔ آپ کے خلفاء بھی کثیر تعداد میں تھے جنہوں نے نہ صرف ہندوستان میں بلکہ بیرون ہندوستان دیگر

ممالک میں پہنچ کر آپ کے طریقہ کی تعلیم واشاعت کی۔ آپ کے خلیفہ ومرید شیخ خالد کردی نے دہلی میں آکر آپ سے فیض حاصل کیا اور پھر مجددیہ طریقہ کو دولت عثمانیہ میں عام کیا۔ حضرت شاہ غلام علیؒ کے تقریباً ۳۸ خلفاء کے نام سوانح کتب میں محفوظ ہیں۔

آپ کے ملفوظات، ارشادات اورفرمودات کے دو مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ ایک بہت مشہور مجموعہ ''در المعارف'' ہے جس کے جامع حضرت شاہ رؤف احمد مجددی ہیں۔ دوسرا مجموعہ ''ملفوظات شریف'' ہے جس کے جامع حضرت مولانا غلام محی الدین قصوری ہیں۔

حضرت شاہ غلام علی فرماتے ہیں فقیر میں 'ف' سے مراد فاقہ کرنا اور توکل کے ساتھ بیٹھنا ہے' ق' سے مراد قناعت کرنا اور رشتہ جستجو توڑنا 'ی' کا مقصد یاد الٰہی میں مشغول رہنا اور دونوں جہاں کو بھلا دینا، 'ر' سے مراد ریاضت اور مجاہدہ میں مشغول رہنا ہے۔ جس نے ان باتوں پر عمل کیا وہی درحقیقت فقیر ہے اور اسے 'ف' سے فضل حق 'ق' سے قرب الٰہی 'ی' سے یاری مولا اور 'ر' سے رحمت ورویت حاصل ہوتی ہے۔ ورنہ 'ف' سے فضیحت 'ق' سے قہر 'ی' سے یاس وناامیدی اور 'ر' سے رسوائی ہاتھ آئے گی۔

آپ فرماتے ہیں کہ تمام امت میں تین کتابیں اپنی مثال آپ ہیں۔ ان میں سے پہلی اللہ پاک کا کلام یعنی قرآن شریف، اس کے بعد بخاری شریف، اس کے بعد مثنوی مولانا روم ہے کہ کلام مجید اور بخاری شریف کے علاوہ اورکوئی کتاب مثنوی شریف کے برابر یا اس جیسی نہیں ہے؟

بہت سے لوگوں کو آپ نے مقامات وحالات عالیہ پر فائز کیا۔ آپ کی دعا سے مشکلات کے حل اور حاجت برآری کے اس قدر واقعات ہوئے کہ لوگوں کے اکثر کام آپ کی دعا سے ہوگئے اور بہت سے عقدے حل ہوگئے۔ طالب علموں کی کثرت کے باوجود ہر ایک کو توجہ سے ایک مقام سے دوسرے مقام اور ایک حال سے دوسرے حال پر پہنچاتے۔ اکثر فاسق وفاجر آپ کی توجہ شریف سے تائب ہوکر راہ راست پر آئے اور کئی کفار آپ کی معمولی سی توجہ

سے مشرف بہ اسلام ہوئے۔ نقل ہے کہ ایک روز ایک بہت ہی حسین وجمیل ہندو لڑکا آپ کی مجلس میں آ گیا۔ سب اہل مجلس اسکی طرف دیکھنے لگے۔ جب آپ کی نظر اس پر پڑی تو وہ زنار توڑ کر مشرف بہ اسلام ہوگیا۔

مولوی کرامت علی جو آپ کے خادم تھے ایک روز ان کے پہلو میں درد ہوا آپ نے اپنا دست مبارک وہاں رکھا تو اسی وقت درد رفع ہوگیا۔

ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میرا لڑکا دو ماہ سے گم ہے آپ دعا وتوجہ فرمائیں کہ وہ آجائے۔ آپ نے فرمایا کہ تیرا لڑکا تو تیرے گھر میں ہے۔ وہ شخص حیران ہوا کہ میں تو ابھی گھر سے آرہا ہوں لیکن حضرت فرماتے ہیں کہ لڑکا گھر میں ہے۔ وہ آپ کی ہدایت کے مطابق گھر پہنچا تو دیکھا کہ لڑکا واقعی گھر میں بیٹھا ہوا ہے۔

حضرت شاہ غلام علی نے مختلف موضوعات پر رسالے لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کی حضرت مرزا مظہر جانجاناں کے احوال وافکار پر دو منفرد کتابیں دستیاب ہیں۔ اول مقامات مظہری، دوم کمالات مظہریہ۔ مقامات مظہری حضرت مرزا جانجاناں مظہرؒ کے روز ولادت سے یوم شہادت تک کے حالات ومقامات پر مشتمل ہے۔ اس میں آپ کے ملفوظات ومکتوبات کا انتخاب بھی دیا گیا ہے۔

آپ کے تقریباً ۱۲۵ مکتوبات کا مجموعہ آپ کے خلیفہ حضرت شاہ رؤف احمد رافت مجددی نے جمع کیا ہے۔ آپ کے ملفوظات کے دو مجموعے دستیاب ہیں۔ پہلا مجموعہ ''درالمعارف'' شاہ رؤف احمد رافت مجددی نے اور دوسرا ''ملفوظات شریفہ'' کے نام سے آپ کے ایک اور خلیفہ حضرت مولانا غلام محی الدین قصوری نے جمع کیا۔ ان ملفوظات گرامی کا ایک ایک لفظ نہایت موثر اور دل کی گہرائیوں تک اتر جانے والا ہے اور بے شک وشبہ مبتدی ومنتہی کو ان ملفوظات کے مطالعہ سے روحانی سرور حاصل ہوتا ہے۔

آپ کو ہمیشہ شہادت کی آرزو رہتی تھی۔ عمر کے آخری حصہ میں بواسیر کا مرض غالب

آ گیا تھا۔ آپ نے اپنے مرید و خلیفہ شاہ ابو سعید مجددیؒ کو اپنا جانشین مقرر کیا اور خانقاہ شریف کے صحن میں اپنا مدفن تجویز فرمایا۔ رحلت فرمانے سے دو تین ماہ قبل شاہ ابو سعید مجددیؒ کو لکھے گئے ایک خط میں آپ نے اس کا ذکر کیا ہے۔ ۲۲ صفر ۱۲۴۰ھ/ ۱۸۲۴ء آپ کا انتقال ہوا۔ آپ کی تدفین خانقاہ شریف میں حضرت مرزا مظہر جانجاناںؒ کے دائیں جانب عمل میں آئی۔ یہ خانقاہ شریف اب درگاہ ابو الخیرؒ کے نام سے مشہور ہے اور دہلی کے چتلی قبر کے علاقہ میں واقع ہے۔

حوالے:

۱۔ در المعارف، شاہ رؤف احمد، مجبوب المطابع، دہلی، ص ۶۵

۲۔ آثار الصنادید، سر سید احمد خان، اردو اکادمی دہلی، ۲۰۰۰، ص ۶۴

۳۔ مکاتیب شریفہ حضرت شاہ غلام علی دہلوی، استانبول، ترکی، ۱۴۰۵ھ/ ۱۹۸۵ء

۴۔ ضمیمہ مقامات مظہری (حالات و مقامات حضرت شمس الدین حبیب اللہ جناب مرزا مظہر جانجاناں) شاہ غلام علی، ۱۲۶۹ھ/ ۱۸۵۲ء، مطبع احمدی، ص ۱۴۵

۵۔ آثار الصنادید، ص ۶۵

۶۔ آثار الصنادید، ص ۶۷

ڈاکٹر محمد تقی علی عابدی، لکھنؤ

شعروادب

جشن غدیر

(منظر فیچر)

آواز: لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ لَاشَرِیْکَ لَکَ .... لَبَّیْکَ لَبَّیْکَ
لَبَّیْکَ
لَبَّیْکَ لَبَّیْکَ

ترنم: حج سے فارغ ہوئے محبوب خدا قبلہ دیں — اور مدینہ کو چلے چھوڑ کے مکہ کی زمیں
ناگہاں راہ میں حاضر ہوئے جبریل امیں — بولے یہ حکم الٰہی ہے ٹھہر جاؤ یہیں
ہے مشیت یہی تکمیل رسالت کردو
مجمع عام میں اعلان خلافت کردو

تحت: عرض کی اے خالق ہر دوسرا — چشم و سر پر ہے مرے فرماں ترا
سب ترا ارشاد لاؤں گا بجا — دشمنوں کا ہے مگر کھٹکا ذرا
فکر جو اعدا نے کی ہے یکدگر — تو نے خود دی ہے مجھے اس کی خبر

آواز: یا ایھا الرسول بلغ ماانزل الیک من ربک .....

تحت: ولیعت کیجئے اب سارے اسرار الٰہیہ — علیؑ کو جو کہ ہے دونوں جہاں میں آپ کا بھائی
بفرمان الٰہی کیجئے تبلیغ ان سب کی — علیؑ کے باب میں جو کچھ خبر ہے آپ نے پائی
نہ کی تعمیل گر اس حکم کی اے خاصۂ داور — رسالت آپ نے پھر حق تعالیٰ کی نہ پہونچائی
اگر کچھ دل میں ہے خوف و خطر اشرار امت کا — خدا رکھے گا محفوظ ان سے کیجئے محفل آرائی

ترنم: اللہ کی رحمت سے یہ کیا دیکھ رہے ہیں — ہم نور محمدؐ کی ضیا دیکھ رہے ہیں
وہ آخری حج اور وہ میدان غدیری — ہم آیۂ بلغ کی ادا دیکھ رہے ہیں

آواز: اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔اللہ اکبر

ترنم: ایمان کے عروج منور کا دن ہے آج — اسلام کے حسین مقدر کا دن ہے آج

انعام لطف و نعمت یزداں کا روز ہے   اظہار شادمانی دور کا دن ہے آج

تحت: محبت کا روز ہے یہ مسرت کا روز ہے   اکمال دین و طاعت و نعمت کا روز ہے

حاوی کمال دین محمدؐ ہوا ہے آج   مولا علی کے جشن خلافت کا روز ہے

آواز: اشھد ان محمد ارسول اللہ ......

آواز: اشھد ان مولانا علیا حجۃ اللہ ......

ترنم: ہو مبارک آج پھر ہم سب منانے آئے ہیں

چہاردہ صد سالہ جشن یادگار مرتضیٰ

تحت: مہ ذی الحجہ کی اٹھارھویں تاریخ تھی جس دن   غدیر خم کے اس اجڑے ہوئے بن میں بہار آئی

غدیر خم کی قسمت کا ستارا دفعتاً چمکا   بنا ہر ایک ذرہ آفتاب چرخ یکتائی

ندا دو جا کے دور افتادگان حد منزل کو   کہ ہے منظور ہم کو اس جگہ پر سب کی یکجائی

جوں ہی نافذ ہوا فرمان حضرتؐ کا بلال اٹھے   صدا حی علی خیر العمل کی سب میں پہونچائی

آواز: حی علی خیر العمل ۔ حی علی خیر العمل ...

تحت: سنو وہ خیر العمل کا ڈنکا بحکم سرکار بج رہا ہے   غدیر خم میں ہے جشن شاہی خلافت مرتضیٰ علیؑ کا

ترنم: بہ فیض آیۂ بلغ ہے آبادی بیاباں میں   ہوا لاکھوں کا مجمع یہ کشش ہے وحی یزداں میں

تحت: میدان خم میں آن کے پہونچا جو کارواں   تھی دوپہر قریب تمازت تھی الاماں

لو لیں چل رہی تھی کہ جلتے تھے استخواں   صحرا میں تھا ابھی سے بپا حشر کا سماں

آتی تھی چار سمت نظر تا حد نگاہ

بس جھاڑیاں جلی ہوئیں جھلسی ہوئی گیاہ

ترنم: حکم ہوتے ہی کجاووں کا وہیں منبر بنا   زینت منبر ہوئے فوراً شہ ختمی مآب

الست اولیٰ بکم کو سن کر بلا کا غل تھا کہ شور محشر   زرا بھی ہوتا ہے جسے تامل وہ ہوتا منکر پیمبری کا

تحت: پس از ثنائے خدائے یکتا ہوا گہر ریز شاہ بطحا   **کہیں ہوں کیا میں تمہارا مولا جواب دو سوچ کر نبیؐ کا**

الست اولیٰ بکم کو بین کر بلا کا غل تھا کہ شور محشر   زرا بھی ہوتا جسے تامل وہ ہوتا منکر پیمبری کا

ترنم: کیا اقرار یہ سب نے کہ اے شاہنشاہ دیں   آپ کے فضل و شرف کا ہے اقرار ہمیں

آپ ہیں ختم رسل رحمت عالم کے امیں   آپ کے در پہ ملائک بھی جھکاتے ہیں جبیں

منحرف آپ سے ہو صاحب ایمان نہیں

اس میں جو شک کرے کافر ہے مسلمان نہیں

تحت: لیا پھر آپ نے دست یداللہ لائے منبر تک — کہا دیکھو امامت ہے اسی بندہ پہ شیدائی
یہ کہہ کر پھر دکھایا وصل امامت اور نبوت کا — فقط اتمام حجت تھی یہ تقریب شناسائی

آواز: و وصی رسول اللہ و خلیفہ بلافصل ...

تحت: دے کر دعا یہ کہنے لگے سرورِ زماں — سن لو بگوش دل کہ نہ ہو اور کچھ گماں
کرتا ہوں صاف تم سے یہ حکم خدا بیاں — حیدرؑ کو حق نے کردیا مولائے دوجہاں

پھر ان کو یوں بلند کیا سوئے آسماں
کہ ہوگئی سپیدئے زیر بغل عیاں

فرمایا پھر کہ دیکھ لو پہچان لو انھیں — حیدرؑ یہی وصی ہیں مرے جان لو انھیں
حکم خدا یہی ہے ولی مان لو انھیں — پھر کہہ رہا ہوں دیکھ لو پہچان لو انھیں

مولا ہوں جس کا میں یہی سب لوگ جان لو
مولا ہیں اس کے حیدرؑ کرار مان لو

آواز: من کنت مولاہ فھذا علی مولاہ

جو نہ بھولے گا کبھی وہ واقعہ دیکھا گیا — ہم بتائیں گے غدیر خم میں کیا دیکھا گیا
ایک تپتی دوپہر میں حاجیوں کے درمیان — دست مرسلؐ پر علیؑ مولابنا دیکھا گیا
نیم تخلّی راز من کنت کا پیمانہ بھی ہے — دشمنوں کو زہر بھی ہے جان مے خانہ بھی ہے

تحت: و آلِ من و الاہ بھی ہے عاد من عاداہ بھی — کیوں نہ ہو محفل میں اپنا بھی ہے بیگانہ بھی ہے
بعد اتممت علیکم شان من کنت بھی دیکھ — جیسا بنتا ہے اسی بج دھج کا پیمانہ بھی ہے

آواز: الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ....

ترنم: آیۂ اتمام نعمت آیۂ بلّغ کے بعد — اللہ اللہ اس قدر توسیع دامان غدیر
یہ بخٍ کہہ کے آگے بڑھنے والا کون ہے آخر — یہ کچھ تہذیب سے ناآشنا معلوم ہوتا ہے

ترنم: منہ سے بخٍ کہہ رہے تھے دل مسوسے تھے کھڑے — تھے جو اس محفل میں پنہاں چند شیطان غدیر

تحت: سن کے یہ غل تھا میرا ک مومن کے تم مولا ہے — شور تھا بخٍ لک بخٍ لک یا بوتراب
اک منافق نے مدینہ میں سنی جب یہ خبر — آتش بغض وحسد سے ہوگیا جل کر کباب
طیش میں آ کر لگا کہنے رسولؐ اللہ سے — آپ کا اسلام سے مطلب یہی تھا کیوں جناب
پہلے تو اقرار وحدانیت حق کا لیا — پھر کہا میں اس کا پیغمبرؐ ہوں اور حق مآب
کیا ابھی تک دل نہیں ٹھنڈا ہوا تھا آپ کا — جو خلافت کا علیؑ کی کردیا نازل عذاب
جو کیا اچھا کیا اب مختصر فرمایئے — یہ خدا کا حکم ہے یا اس کے موجد ہیں جناب

آپ نے فرمایا حکم حق تھا جو میں نے کیا — سنتے ہی یہ اور بھی کھانے لگا وہ پیچ و تاب
کرکے رخ سوئے فلک کہنے لگا سن اے خدا — گر یہ تیرا حکم ہے تو مجھ پہ نازل کر عذاب
سر پہ اک پتھر گرا سیدھا در آیا خاک میں — دم کے دم میں داخل دوزخ ہوا خانہ خراب

ترنم: تیری ولا نہیں ہے تو ایماں خیال خام — کلمہ میں تیرا نام نہیں تو ناتمام
تیری ولا بغیر عبادت میں ہے کلام — سب کچھ ہے ایک تیری ولا اور والسلام

قرآن کیا ہے؟ تیری فضیلت ہے اور کیا
ایمان کیا ہے؟ تیری محبت ہے اور کیا

تحت: علیؑ ہر اک سے اعلیٰ ہیں اگر ایمان سے پوچھو — یہ دریائے شرف ہیں سورۂ رحمان سے پوچھو
امیر المومنینؑ کیا چیز ہیں قرآن سے پوچھو — مسلمانوں! اطیعوا اللہ کے فرمان سے پوچھو

خدا و مصطفیٰؐ کی طرح فرض ان کی اطاعت ہے

ترنم: لکھے ہوں ماتھے پہ میرے یہی حروف جلی — علی امام من است و منم غلام علی

علی امام من است و منم غلام علیؑ

علیؑ امام من است و منم غلام علیؑ

عباس رضا نیّر جلالپوری

کہانی، بیانیہ اور انیسؔ

(مرثیہ درحال شیرین کا خصوصی تجزیہ)

اچھی کہانی، بری کہانی، بڑی کہانی، چھوٹی کہانی، پرانی، نئی کہانی، مسرت آمیز کہانی، درد انگیز کہانی، کہانی بہر حال کہانی ہوتی ہے۔ کبھی کبھی کہانی کہنے کا فن معمولی کہانیوں کو اچھی کہانیوں میں بدل دیتا ہے۔ چھوٹی کہانیوں کو بڑی کہانی بنا دیتا ہے اور کبھی کبھی کہانی کہنے کے فن کی کوتاہی کے نتیجے میں اچھی کہانیاں بھی انسانی فکر کو متاثر کرنے میں ناکام رہ جاتی ہیں۔ یہ کہانی کہنے کا فن ہی ہے جو فرضی واقعات کو تاریخی واقعیت کے زمرے میں داخل کر دیتا ہے اور کبھی کبھی تاریخی واقعیت کہانی کہنے کے فن کے فقدان کے سبب داستان گم گشتہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ کہانی کو اگر تاریخی صداقت کا سہارا مل جائے تو جہاں کہانی کی معنویت او اثر انگیزی ہزاروں گنا بڑھ جاتی ہے وہیں کہانی کہنے والے کی اپنی ذمہ داریوں میں بھی ہزار گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔ چونکہ تاریخی کہانی کو پر پھیلانے کے لئے آسمان تخیل کی نہ وہ وسعتیں حاصل ہوتی ہیں اور نہ وہ اڑن پرواز جو ایک فرضی کہانی کو فطری طور پر حاصل ہوتا ہے۔ اس کے باوجود تاریخی کہانی کو بھی کہانی کہنے کے ایک ایسے کمال فن کی ضرورت ہے جو اس کی تاریخی واقعیت کو کسی تخیلاتی مفروضے کے سہاروں سے مستحکم نہ کرے کیونکہ اس میں خود تاریخی صداقتوں کے مجروح ہونے کا خدشہ رہتا ہے۔ تاریخی واقعہ کو بیان کرتے وقت کہانی کار کی اہم ترین ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنی تخیل کے بازوں کو حقیقت کی دنیا سے پرے پھیلانے کی کوشش نہ کرے اور اس کے باوجود کہانی کہنے کے فن کی تمام ذمہ داریوں کو پورا کر دے۔ ایسا شاذ و نادر ہی ہوا ہے کہ کہانی کار کی تخیل نے کہانی کی تاریخی واقعیت کو مجروح نہ کیا ہو۔ کیوں کہ تخیل واقعہ سے

ماورائی ہے۔ لیکن جن تاریخی واقعات میں کہانی بننے کی صلاحیت ہے ان واقعات میں جہاں جہاں تاریخ خاموش ہے وہاں وہاں تخیل مناظر اور مکالمے پیدا کر دیتی ہے۔ کہانی کہنے والے کا بنیادی فن یہی ہے کہ وہ تاریخ کی بین السطور خاموشی کو منظر یا مکالمے میں ڈھالتے وقت جو کچھ تخلیق کرے وہ اس واقعے کے مزاج، کیفیت اور محل کے خلاف نہ ہو۔ گویا قاری یا سامع کو یہ لگے کہ بیشک تاریخ میں اس منظر یا مکالمے کا تذکرہ بھلے ہی نہ ہو لیکن اگر یہ منظر اس واقعے میں پیدا ہوا ہوتا تو یقیناً یہی مکالمہ ہوتا۔ تب تاریخ کی بین السطور خاموشی کو لفظوں کا لبادہ دینے والا فنکار مورخ کی مشاہدہ کرنے والی آنکھ بن جاتا ہے۔ یعنی قاری یا سامع یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ یہ منظر اور یہ مکالمہ سب کچھ واقعہ میں موجود تھا مورخ نے احتیاط اختصار کی وجہ سے اس کو قلم بند نہیں کیا۔

اردو کے بہت سے مرثیہ نگاروں نے کربلا کی درد انگیز تاریخ کو بڑی خوب صورتی کے ساتھ موثر کہانی بنا کر عوام تک پہنچایا ہے۔ اگر چہ مرثیہ نگاروں کی کہانی نے کہیں کہیں تاریخ سے تجاوز کیا ہے لیکن کہانی کو محض تخیل یا مفروضات کے حوالے بھی نہیں کیا ہے۔ اردو مرثیے میں اگر کہیں تاریخ سے تجاوز کی کوئی مثال نظر آتی ہے تو اسے بھی کسی نہ کسی روایت کا سہارا ضرور حاصل ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس روایت کے تاریخی استناد پر بحث کی گنجائش موجود ہو۔ لیکن ایسی ساری روایتوں کا رشتہ ایک ہی ایسی مستحکم واقعیت سے جڑا ہوا ہے جو انھیں تاریخی استحکام بخش دیتی ہے۔ یوں بھی مرثیہ نگاروں کی کہانی کا موضوع چند ایک جہتوں میں ہی پرواز کی اجازت دیتا ہے۔ کربلا کی کہانی خود اپنے اندر اتنے تنوع اور اتار چڑھاؤ رکھتی ہے کہ اس کے لئے کسی مفروضے کا سہارا لینے کی ضرورت ہے بھی نہیں۔ ایک کہانی کے جو لازمی عناصر ہوتے ہیں وہ سب کربلا کے تاریخی سانحے میں موجود ہیں جہاں ایک طرف عشق، عرفان اور آگہی ہے تو دوسری طرف ظلم، وحشت اور بربریت۔ ادھر محبت ایثار اور جانثاری ہے تو ادھر مکر، فریب اور عیاری۔ گویا ایک کامیاب کہانی کے سہارے تلازمات کربلا کے تاریخی واقعہ

سے بہ آسانی فراہم کئے جاسکتے ہیں۔ کہانی کی دنیا میں عظیم ترین شاہکار غم انجام واقع ہوئے ہیں چنانچہ کربلا کی کہانی ایک ایسا رزمیہ ہے جس کا اختتام غم بلکہ انتہائے غم پر ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے بھی کربلا کہانی کا ایک شاہکار ہے۔ مرثیے نے اپنی شعری نزاکتوں اور فنی طاقتوں سے اس حزنیہ کہانی کی درد انگیزیوں کو انسانی فطرت کے عین مطابق اور انسانی فکر کے حد درجہ قریب کردیا ہے۔ اس طرح مرثیے نے کربلا کی کہانی کو ایک عام آدمی تک پہنچانے میں اہم ترین کردار ادا کیا ہے۔

کہانی کہنے کا فن یوں تو ہر اچھے مرثیہ نگار کے یہاں پایا جاتا ہے لیکن میر انیسؔ نے کہانی کہنے کے فن کو اعتبار وعظمت کی جن اونچائیوں تک پہنچا دیا ہے وہ فقید المثال ہے۔ انیسؔ اپنی فکر وفنی صلاحیتوں کی بنا پر مرثیہ نگاروں میں منفرد اور ممتاز نظر آتے ہیں۔

قدرت کے عطا کردہ بیانیہ کے اس فن نے جہاں انیس کی وقعت وعظمت میں اضافہ کیا وہیں انیسؔ کی باریک بینی، فطری جذبات اور نفسیات کی عکاسی نے بیانیہ کے فن کی عظمتوں میں بھی اضافہ کیا۔ انیسؔ کا تخیل واقعے کے پس منظر میں چھپی ہوئی ان جزئیات کو بھی تلاش کرلیتا ہے جو بیانیہ میں شامل ہوکر کہانی کا لازمی عنصر نظر آنے لگتی ہیں اور واقعے کے نفسیاتی ماحول کی تشریح کرنے لگتی ہیں۔ کہانی اور بیانیہ کے حوالے سے جائزہ لینے کے لئے یہاں ہم نے انیس کے مشہور مرثیے کا انتخاب کیا ہے۔

ع۔ اے مومنو کیا صادق الاقرار تھے شبیرؑ

یہ مرثیہ زوجۂ امام حسینؑ حضرت شہر بانو اور خود امام حسینؑ کی خلوت کے ایک لطیف ترین لمحے سے آغاز ہوتا ہے۔ حضرت شہر بانو شہنشاہ ایران یزدجرد کی بیٹی اور امام زین العابدین کی والدہ ہیں۔ ایک عصمت مآب خلوت کا تمام تر تقدس انیسؔ کی نگاہ میں ہے۔ زوجین کے درمیان ہونے والی گفتگو کو انیسؔ نے اپنی عقیدت واحترام کے باوجود عام انسانی سماج کے حد درجہ نزدیک اور فطری کردیا ہے۔ امام حسینؑ حضرت شہر بانو کی کنیز شیریں کی آنکھوں کی

تعریف کرتے ہیں۔ چونکہ حضرت شہر بانو معصوم نہیں ہیں اس لئے انھیں یہ گمان گذرتا ہے کہ شاید امام حسینؑ کو یہ کنیز پسند خاطر ہو۔ ایک وفا شعار اور اطاعت گزار بیوی فطرت کے عین مطابق اپنی کنیز کو سجا سنوار کے امام حسینؑ کی کنیزی کے لئے پیش کرتی ہے۔ اپنی خواہشات نفسانی کو رضائے الٰہی کی خاطر بیچ کرنے والا معصوم امام کسی کنیز کی آنکھوں کی تعریف اس مقصد سے کربھی کیسے سکتا ہے۔ لیکن امام حسینؑ جناب شہر بانو کے گمان کو اپنی وسیع القلبی اور عفو کی عادت سے کام لے کر کنیزی میں قبول کر کے انعام واکرام دے کر آزاد کر دیتے ہیں ۔ وہ کنیز جسے اس گھرانے کی خدمت کرتے کرتے گھر کے ایک ایک فرد سے عشق ہو چکا ہو اور اسے یہ جدائی شاق تو ہے لیکن حکم امام سے مجبور ہو کر ڈیوڑھی سے رخصت ہوتے وقت ہر فرد سے وعدہ لیتی ہے کہ وہ اسے اپنے غم اور خوشی سے دور نہ کرے۔ ہر موقع پر اسے یاد کرے اور کسی دن اس کے یہاں مہمان ہونا قبول فرمائے۔ امام حسینؑ وعدہ فرما لیتے ہیں لیکن یہ وعدہ بڑے عجیب انداز میں ایفا ہوتا ہے یعنی امام حسینؑ کی شہادت کے بعد ! شام کا لشکر حسینؑ کا سر بریدہ نیزے پر رکھ کر جب دمشق کے لئے روانہ ہوتا ہے تو راستے میں وہ قریہ بھی ہوتا ہے جہاں شیریں آزادی کے بعد اپنی خانگی زندگی گذارنے لگتی ہے ۔ حسینؑ کا بریدہ سر اور حسینؑ کے تمام رسن بستہ حرم ایک شب شیریں کے یہاں مہمان ہوتے ہیں۔ مگر کیسے ؟ یہی اس کہانی کا حسن اور کلائمکس ہے۔ اس کہانی میں انیسؔ نے اپنی فنکارانہ چابک دستی سے پورے بیانیے کو اتنا فطری اور بے ساختہ بنا دیا ہے کہ قاری یا سامع کے ذہن کو کسی تاریخی استدلال کی حاجت نہیں رہ جاتی ۔ کہانی کا آغاز شیریں کی آنکھوں کے حسن کی تعریف سے ہوتا ہے اور کہانی کے اختتام میں شیریں قدرت سے شکوہ کرتی نظر آتی ہے کہ کیا اسی اندوہ ناک منظر کو دیکھنے کے لئے میری آنکھیں سلامت ہیں۔ کیوں ! ہے نا انیسؔ کو کہانی اور بیانیہ کے فن پر پوری قدرت !!

۸۸ ربند پر مشتمل انیس کا یہ مرثیہ امام حسینؑ کے صادق الاقرار ہونے کی تعریف سے شروع ہوتا ہے۔ انیسؔ نے امام حسینؑ کے صادق الاقرار ہونے کی دلیل میں حسین اور خدا

کے درمیان ہونے والے اس وعدہ طفلی کا حوالہ پیش کیا ہے جو امام حسینؑ نے عصر عاشور سجدے میں سر قلم کرا کے وفا کیا ہے

اے مومنو کیا صادق الاقرار تھے شبیرؑ دریائے وفا کے در شہوار تھے شبیرؑ

خوشنودی خالق کے طلبگار تھے شبیرؑ اقلیم صداقت کے جہاں دار تھے شبیرؑ

چاہا جو خدا نے وہی چاہا شہ دیں نے

کیا وعدہ طفلی کو نباہا شہ دیں نے

مرثیے کے ابتدائی چار بند اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ لیکن خوبی یہ ہے کہ انیس نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کسی شاعرانہ مبالغے سے کام نہیں لیا ہے۔ بلکہ تاریخی واقعیت کو دلیل بنا کر امام حسینؑ کے مزاج ایفائے عہد کو ظاہر کیا ہے مثلاً تیسرے بند کی بیت دیکھئے

وعدہ فقط اک سر کا تھا درگاہ خدا میں

حضرت نے بہتر دیئے سر راہ خدا میں

یا پھر چوتھے بند کی بیت ؂

اس طرح کے صادق کبھی دیکھے ہیں کسی نے

مر کر کیا وعدے کو وفا سبط نبی نے

پانچویں بند سے انیس نے کہانی کا آغاز کیا ہے۔ منظر امام حسینؑ اور ان کی زوجہ حضرت شہر بانو کی خلوت کا ہے۔ جہاں بقول انیس

بانو سے جو مانوس شہنشاہ زمن تھے

کچھ پیار کی باتیں تھیں محبت کے سخن تھے

کہانی کی دلکشی اس کی ابتدا سے ہی قائم ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ اس گفتگو کے محبت میں امام حسینؑ کی نگاہ حضرت شہر بانو کی کنیز خاص شیریں کی خوبصورت آنکھوں پر پہنچ جاتی

ہے۔ دیکھیے انیسؔ اس لطیف منظر کو کسی قدر فطری انداز میں پیش کرتے ہیں ؎

شیریں پہ جو حضرت کی نظر جا پڑی اک بار　　بانو سے یہ بولے بہ تبسم شہ ابرار
خوش چشم کس مرتبہ شیریں خوش اطوار　　اس طرح کی آنکھیں کبھی دیکھی نہیں زنہار

فرمائی جو یہ بات شہنشاہ امم نے
نیوڑھا لیا سر دختر سلطان عجم نے

مرثیے کے اگلے پانچ بند ایک محبت گزار اور وفا شعار بیوی کی نفسیات کا بیانیہ ہیں۔ جہاں ایک خاتون شوہر کی خوشنودی کی خاطر اپنی کنیز کو اپنے سے زیادہ محترم اور صاحب جاہ کہتی ہے۔ صرف اس لئے کہ اس کے ذی جاہ شوہر کی نگاہ پسند نے اِسے منتخب کرلیا ہے حالانکہ یہ عام عورتوں کی فطرت سے بہت بعید ہے لیکن جو خاتون حسینؑ جیسی عظیم شخصیت کی زوجیت میں ہو، اپنے شوہر کیلئے اس کا یہ جذبۂ اطاعت قطعی غیر مانوس معلوم نہیں ہوتا۔ بلکہ حضرت شہر بانو کے کوائف وحالات سے آگاہ لوگوں کیلئے یہی بات عین مطابق فطرت معلوم ہوتی ہے۔

یہیں سے انیسؔ اپنے قاری کو نہ صرف یہ کہ حضرت شہر بانو کی شخصیت اور مزاج سے متعارف کراتے ہیں بلکہ پورے خانوادۂ عصمت کے ماحول سے نہایت مختصر الفاظ اور انتہائے قدرت فن کے ساتھ روشناس کرادیتے ہیں۔ دیکھئے کہانی کس طرح آگے بڑھتی ہے۔ شہر بانو شیریں کو اشارے سے بلاتی ہیں۔ ایک حجرے میں لے جاتی ہیں اُسے خوبصورت پوشاک پہناتی ہیں۔ گیسوؤں میں شانہ کرتی ہیں۔ آنکھوں میں سرمہ لگاتی ہیں۔ یہ سب ہوتے ہوئے دیکھ کر بچپن سے شہر بانو کی تربیت میں رہنے والی کنیز ملکہ سے بصد استعجاب ماجرہ پوچھتی ہے۔ ملکہ بہ ہزار افتخار آج خود کو کنیز کی لونڈی بتاتی ہے۔ شیریں کو موتی ہیروں سے آراستہ کرلینے کے بعد شہر بانو امام حسینؑ کو حجرے میں بلاتی ہیں۔ امام حسینؑ کو احساس ہوتا ہے کہ شاید شہر بانو میری باتوں سے آزردہ ہوں۔ چنانچہ انیسؔ اس مقام پر امام حسینؑ کی زبان سے یہ مکالمہ ادا کراتے ہیں ؎

جو سمجھی ہو تم اس کا مجھے دھیان نہیں ہے۔
جب تم سی ہو بی بی تو کچھ ارمان نہیں ہے

کہانی آگے بڑھتی ہے۔ امام حسینؑ اپنی اطاعت شعار بیوی کے نذرانے کو قبول کرتے ہی، آزاد کر دیتے ہیں اور اس طرح اپنی زوجہ کو زیان وقار واحترام کی بدگمانی سے بھی آزاد کر دیتے ہیں۔

تم نے تو دیا ہم کو صادق ہو وفا میں
ہم نے اسے آزاد کیا راہ خدا میں

حکم امام پاکر شہر بانو اپنی کنیز کو کثیر زرومال اور انعام واکرام کے ساتھ آزاد کرتی ہیں۔ امام حسینؑ شہربانو سے آج اس خاص انداز سے مائل بہ کرم ہونے کا سبب پوچھتے ہیں۔ منظر مزید التفات کا مظہر ہوجاتا ہے۔

بانو نے سنی جب شہ والا کی یہ گفتار — خوش ہو کے پھری گرد محبت سے کئی بار
اور اس کو دیا زیور و زر، درہم ودینار — حضرت نے کہا اس کا سبب کیا مری غم خوار

اوروں کو نہ اتنا زرو زیور دیا تم نے
شیریں سے یہ الفت کہ غنی کر دیا تم نے

اگلا بند امام حسینؑ کے سوال کی وضاحت کرتا ہے اور اسی بند کو انیسؔ خانوادہ عصمت وطہارت کی عظمتوں کے اظہار کا زینہ بنا دیتے ہیں۔

بانو نے کہا ان سے ہو کیوں کر یہ برابر — آزاد کیا تھا انھیں میں نے مرے سرور
ہر چند کہ سلطان عجم کی ہوں میں دختر — پر فاطمہ زہراؑ کی کنیزوں سے ہوں کمتر

خود صدقے ہوں شیریں پہ اگر میں تو بجا ہے
فرزند نبیؐ نے اسے آزاد کیا ہے

یہاں کہانی میں ایک اہم موڑ آتا ہے۔ کہانی ہجر کے مناظر میں داخل ہونے لگتی

ہے۔ یہیں پر انیسؔ کہانی میں آگے چل کر کام آنے والے بعض اہم کرداروں کو اپنے قاری سے بیک وقت متعارف کرادیتے ہیں ۔ مثلاً سید سجاد اور جناب زینب کے کردار۔ ان کرداروں کے تعارف میں شیریں کی ان سے والہانہ عقیدتیں بھی واضح ہوجاتی ہیں ۔ انیسؔ نے نہایت ذہانت کے ساتھ کہانی میں آنے والے پیچ وخم کے لئے ماحول کی تشکیل یہیں سے کردی ہے ۔ اپنی رہائی کی خبر پاکر شیریں حزن وملال اور ہجر ومفارقت کی کیفیتوں سے اس طرح دو چار ہوتی ہے۔

شیریں کے یہ سن کر ہوئے اشک آنکھوں سے جاری — لیں ہاتھوں سے بانو کی بلائیں بھی کئی باری
سجاد کو لے گود میں بولی کہ میں واری — اب تم سے جدا ہوتی ہے یہ لونڈی تمہاری
خط بھیج کے اپنا مرادل شاد کروگے
اس پالنے والی کو بھی کیا یاد کروگے

پھر پاؤں پہ سر حضرت زینب کے جھکایا — شفقت سے گلے شاہ کی خواہر نے لگایا
جب آپ کو اس نے قدم شہ پہ گرایا — سب روتے تھے حضرت کو بھی رونا بہت آیا
مولا کے نہ قدموں سے جدا ہوتی تھی شیریں
نعلین سے نتھ ملتی تھی اور روتی تھی شیریں

کہانی کی حزنیہ فضا قائم ہوچکی ہے۔ شیریں امام حسینؑ سے مع اہل حرم اپنے یہاں کسی نہ کسی روز مہمان ہونے کی درخواست کرتی ہے۔ امام حسینؑ کنیز کی درخواست کو قبول کرلیتے ہیں۔ اس عہد وپیمان کو انیس نے ایک بیت میں جس طرح نظم کردیا ہے وہ کہانی کے انجام سے واقف قارئین کے لئے پورے مرثیے سے کم نہیں ہے۔

فرمایا نہ کڑھ پورے سب ارماں ترے ہوں گے
ہم ساتھ حرم کو لئے مہماں ترے ہوں گے

انیس کا بیانیہ نہایت خوبصورتی سے کہانی کے نشیب وفراز طے کرتا ہوا یہاں تک پہنچتا

ہے۔ یہاں انیس کہانی میں گریز پیدا کرتے ہیں۔ کہانی ایک نیا موڑ لیتی ہے۔ شیریں خانوادۂ اہلبیت سے جدا ہوتی ہے۔ یہ وہ موڑ ہے جہاں سے کہانی تاریخ سے کٹ کر روایت کی طرف سفر کرتی ہے۔ لیکن روایت تھوڑی ہی دیر میں پھر تاریخ کی طرف لوٹ آتی ہے۔ کوئی اور کہانی کار ہوتا تو روایت کی بھول بھلیوں میں تاریخ کو فراموش کر جاتا لیکن انیسؔ کا کمال یہ ہے کہ وہ روایت، تاریخ اور کہانی تینوں کو اپنے بیانیے میں مضبوطی سے باندھے رکھتے ہیں کہانی کا نیا رخ دیکھئے۔

اک کوہ پہ تھا قلعہ کہ گھر اس کا تھا اس جا　　واں پہنچی تو شیریں کے ہوا حسن کا چرچا
تھا ایک یہودی کہ وہ طالب ہوا اس کا　　شیریں نے سنا جب تو پیام اس کو یہ بھیجا

گر ہے مرے وصلت کی تمنا ترے جی میں
تو کفر کو تو چھوڑ کے آ دین نبی میں

اپنی کہانی کے لئے انیسؔ کو جو ماحول دینا ہے اس کی بنیاد انیسؔ نے اس بند میں رکھ دی۔ ایک یہودی امیر کا شیریں کے حسن پر فریفتہ ہونا۔ پیغام عقد بھیجنا، جواباً شیریں کا یہودی کو مشرف بہ اسلام ہونے کی شرط لگانا۔ ساری جزئیات کہانی میں آنیوالے امور کی تمہید معلوم ہوتی ہیں۔ یہاں شیریں کی شادی کا واقعہ روایت کے سہارے کھڑا ہوتا ہے۔ لیکن انیسؔ کا مقصد کہانی میں آنے والے پیچ وخم کے لئے فضا کو سازگار بنانا ہے۔ دیکھئے انیسؔ یہاں روایت کے سیلاب میں بہے نہیں ہیں بلکہ کس قدر اختصار کے ساتھ روایت پر ایک نظر ڈال کر تاریخ کی طرف لوٹ آئے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ انیسؔ اپنی کہانی کا پیراہن بنانے کے لئے تاریخ کے دامن میں روایات کے موتیوں سے کشیدہ کاری کرتے جا رہے ہیں۔

شیریں اپنی ازدواجی زندگی کے دن گزار رہی ہے۔ اب مرثیے میں شریں کے عشق حسینؑ اور فرقت حسینؑ میں اس کے اضطراب کا بیان شروع ہوتا ہے۔ مرثیے کے مسلسل سات بند حسینؑ کے وعدے کا انتظار اور شوق انتظار میں شیریں کی اضطراری کیفیات کی ترجمانی پر

مشتغل ہیں جو

کہتی تھی کہ یارب مرا گھر شہ کو دکھانا — وہ دن ہو کہ ہو زینب و کلثوم کا آنا
شبیر ادھر کو کہیں جلدی ہوں روانہ — اس لونڈی پہ اب شاق ہے تشریف نہ لانا
آقا مرے کیا جانے کب آئیں گے ادھر کو
کیا پھر کبھی دیکھوں گی میں زہرا کے پسر کو

کہتی کبھی ہمسایوں سے یہ بیٹھ کے باہم — آویں گے مدینے سے یہاں سید اکرم
خاتون قیامت ہے جو مخدومۂ عالم — اب بیٹیوں سے ان کی ملادیں گے تمہیں ہم
احمدؐ کی زیارت شہؑ والا کی ملاقات
زینبؑ کی ملاقات ہے زہراؑ کی ملاقات

اے بیبیو آقا ہیں مرے صادق الاقرار — آنے کو کہا ہے مرے گھر آئیں گے اک بار
زہرا کے چمن سے یہ مکاں ہوئے گا گلزار — فرزند نبی کا تمہیں دکھلائیں گے دیدار
آنکھیں قدم سبط پیمبر پہ ملیں گے
ہم دور تک لینے کو مولا کے چلیں گے

رہتا تھا یہی اس کو تردد سحر و شام — اندوختہ کرتی تھی ضیافت کا سر انجام
جو میوے تھے مرغوب امام ذوی الاکرام — ان میووں کو منگواتی تھی دے دے کے وہ انعام
شوہر کوئی تحفہ جو اسے دیتا تھا لاکر
حضرت کے لئے رکھتی وہ کشتی میں لگا کر

تھا دھیان کہ آویں گے سفر سے شہ والا — کورے گھڑوں میں پانی بھرا رکھتی تھی ٹھنڈا
دن ڈھلتا تو شوہر سے یہ کرتی تھی تقاضا — شہ آتے نہ ہوں شہر کے ناکے پہ ذرا جا
آمد ہو اگر لشکر حضرت کی ادھر سے
میں بھی چلوں شہزادیوں کے لینے کو گھر سے

یہ شہ کے ہے لشکر کا نشاں اور یہ آثار آگے علم سبز لئے ہوگا علمدار
ہوئیں گے عزیز ورفقا گھوڑوں پہ اسوار اور بیچ میں ہوگا خلف حیدر کرار

ملبوس رسول عربی ہووے گا بر میں
تیغ اسد اللہ لگی ہوگی کمر میں

ناموس کی کچھ فاصلے سے ہوگی سواری آوے گی نظر حضرت زینبؑ کی عماری
ہودج میں سوار آئے گی شہزادی ہماری اور محملوں میں ہوویں گی سیدانیاں ساری

آگے یہ نقیبوں کا سخن ہووے گا سب سے
خاموش چلے جاؤ تفاوت سے ادب سے

یہاں انیسؔ نے اپنی تخیل کو شیریں کا تخیل بنادیا ہے۔ محسوس بھی نہیں ہوتا کہ یہاں انیسؔ کے تخیل کا کہیں کوئی دخل ہے۔ بلکہ ایسا لگتا ہے کہ ایک ماہر نفسیات کی مانند انیسؔ شیریں کے تخیل کے پیچ وخم کو پڑھتے جارہے ہیں اور اپنے لفظوں کے سہارے انھیں مرثیے کے پیکر میں ڈھالتے ہیں جارہے ہیں۔ شیریں کا تصور مزاج خانوادۂ رسالت اس کے جاہ وحشم اور شان وشوکت کے مطابق سوار اور پیادوں کے مقامات کو ترتیب دیتا جاتا ہے لیکن جب یہ تصور حقیقت سے روشناس ہوتا ہے تو شکست خواب کی ساری اذیتوں اور زمانے کی نیرنگیوں کا مرثیہ بن جاتا ہے۔

آگے یہ نقیبوں کا سخن ہووے گا سب سے
خاموش چلے جاؤ تفاوت سے ادب سے

کیوں! مرثیہ ہوگیا نہیں؟ یہاں شریں انتظار واضطرار کی شدت سے دوچار ہورہی ہے اور ادھر امام حسینؑ اپنے اعزا وانصار کے ساتھ کربلا کے دشت میں شہید ہوچکے ہیں۔ انیس تھوڑی دیر کے لئے کہانی کو یہیں روک دیتے ہیں اور نہایت اختصار وجامعیت کے ساتھ کل دس گیارہ بندوں میں قتل سید الشہداء اہل حرم کی اسیری، طوق وسلاسل میں سید سجاد کی گرفتاری مقتولین کی لاشوں پہ بیبیوں اور یتیموں کی گریہ وزاری۔ لشکر اعدا کی شقاوت قلبی، قیدیوں پہ تغیر وتعدی،

شدت الم سے عابد بیمار کی شکستہ نپائی زینب وام کلثوم کی زبوں حالی کا ماجرہ بیان کرتے ہیں۔ جہاں قیدیوں کے ہونٹوں پر بکا کے الفاظ ہیں۔ لاشِ حسین سے زینب کی گفتگو ہے، قتل کے بعد بھی امام حسینؑ کے لبوں پر یا خدا کے کلمات ہیں، یتیموں کے بین ہیں۔ اشقیا کی گھڑکیاں ہیں۔ پیاسے بچوں کو نفسیاتی اذیت پہنچانے کے لئے پانی سے بھرے ہوئے گھڑے ہیں۔ یہ سب بیانیہ کا وہ خوبصورت حصہ ہیں کہ قاری اپنے آپ کو ان مناظر میں شامل نظر آنے لگتا ہے۔

کہانی پھر ایک نئے اور اہم موڑ کی طرف مڑتی ہے۔ یہاں کہانی تاریخ کا سہارا لے کر کھڑی ہوتی ہے۔ لیکن یہاں انیس کے بیانیے نے تاریخ میں بھی کہانی جیسا حسن پیدا کر دیا ہے۔ اہل حرم اسیر ہوکر کربلا سے دمشق کی طرف روانہ ہیں۔ نیزوں پر شہیدوں کے سر بلند ہیں جس نیزے پہ حسینؑ کا سر بلند ہے وہ نیزہ ایک دوراہے پر پہنچ کر رک جاتا ہے۔ حسین کا بریدہ سر میدانی راستے پر جانے سے انکار کر دیتا ہے۔ چونکہ دوسرا کہساری راستہ قلعہ شیریں کی طرف سے ہوکر گذرتا ہے۔ کہانی کا یہ موڑ بڑا معنی خیز ہے۔ امام حسینؑ شیریں کے گھر مہمان ہونے کے اقرار کو پورا کرنا چاہتے ہیں۔ وعدے کی ایفا کا وقت آپہنچا ہے۔ سر حسین سے اس اعجاز کے نمایاں ہونے پر انیس عابد بیمار اور اشقیا کے بیچ یہ مکالمہ ادا کرتے ہیں:

رکنے کا سر شاہ کے ظاہر کرو اسرار
گھبرا کے لگے کہنے یہ عابد سے ستمگار
ہے مخبر صادق کا پسر صادق الاقرار
فرمانے لگے رو کے یہ تب عابد بیمار

اعجاز ہوا یہ جو سر سبط نبی سے
اس راہ میں مہمانی کا وعدہ ہے کسی سے

اور کہانی ایک بار پھر مرثیے کا مطلع دہرانے لگتی ہے۔ ''اے مومنو کیا صادق الاقرار تھے شبیر'' قافلہ قلعہ شیریں کی جانب بڑھ رہا ہے۔ شیریں کو اطلاع ہوتی ہے کہ امام حسین کا قافلہ نہایت تزک واحتشام کے ساتھ اس کے گھر کی جانب آرہا ہے۔ ایک مدت سے انتظار کھینچنے والے عاشق صادق پر زیارت محبوب کا مژدہ پاکر جو کیفیت طاری ہوسکتی ہے۔ نہایت

فطری انداز میں انیسؔ اسکا بیان کرتے ہیں ۔

اس مژدے کو سنتے ہی جو خوش ہوگئی شیریں　　بولی کہ ہوئی اب دل بے تاب کو تسکین
صد شکر کہ خالق نے نہ رکھا مجھے غمگین　　وعدہ جو کیا تھا اس بھولے نہ شہ دین
اب چل کے قدم پر شہ والا کے گروں گی
دن میرے پھرے گرد میں آقا کے پھروں گی

عورات محلّہ کو بلا کر یہ سنایا　　دو تہنیت اے بیبیو آقا مرا آیا
یہ روز مبارک مجھے قسمت نے دکھایا　　اب عرش کے پائے سے ہے بڑھ کر مرا پایا
کونین میں ممتاز کیا شاہ زمن نے
لونڈی کو سرافراز کیا شاہ زمن نے

مرثیے کے اگلے دو بند شیریں کی ہمسایہ عورتوں کے اشتیاق زیارت کے ذکر پر مشتمل ہیں۔ جو شیریں کے انتظار کی شدت اور حسینؑ کے صادق الاقرار ہونے کے ساتھ اس مقدس گھرانے کے احترام کا بھی پتہ دیتے ہیں۔شیریں حسینؑ کی ڈیوڑھی سے جدا ہونے کے بعد بھی حسینؑ کے گھر کو کوئی دم بھول نہیں پائی اور اپنے ہمسایوں سے اس نے حسینؑ کے گھر آنے کی عظمتوں کا تذکرہ اس انداز میں کیا کہ تمام اہل قریہ قافلہ حسینؑ کی زیارت کے مشتاق نظر آنے لگے۔ قافلہ حسینؑ سے شیریں کے ہمسایوں کا یہ جذباتی لگاؤ دیکھیے ۔

سب نے کہا خوش ہو کے ہمیں بھول نہ جانا　　ہم کو بھی بہن حضرت زینبؑ سے ملانا
شہزادی کا اپنی ہمیں دیدار دکھانا　　قسمت سے ہوا فاطمہ کے لال کا آنا
حضرت کی سواری کا حشم دیکھیں گے ہم بھی
سردار دوعالم کے قدم دیکھیں گے ہم بھی

عباس علی کے قد و قامت کے ہیں مشتاق　　اور قاسم مہرو کی بھی طلعت کے ہیں مشتاق
زینب کے جگر بندوں کی صورت کے ہیں مشتاق　　ہم مثل پیمبر کی زیارت کے ہیں مشتاق

گلرو ہے کوئی ان میں کوئی غنچہ دہن ہے
کہتے ہیں بڑے حسن پہ زہراؑ کا چمن ہے

کہانی آگے بڑھتی ہے۔ آنے والے مہمانوں کے انتظار میں شیریں کی بے قراری شدید ہوتی جاتی ہے۔ وہ اپنے محترم اور باوقار مہمانوں کے لئے کہیں کرسی بچھاتی ہے، کہیں مسند، کبھی حجرے میں رکھی ہوئی نذر کی کشتیاں سجاتی ہے کبھی اضطراب واضطرار میں صحن کے دروازے پر جاتی ہے۔ یہیں کہانی میں Thrill کا اضافہ ہوتا ہے۔ مدت سے ہجر کا غم کھینچنے والی شیریں شام ہوتے ہوتے امید وبیم کی منزلوں سے گذرنے لگتی ہے۔ انیسؔ شیریں کی امید و یاس کا بیان اسی طرح کرتے ہیں۔

دن ڈھل گیا اور جب نہ ہوئی آمد سروؑ — شوہر سے کہا اب تو نہایت ہوں میں مضطر
جا دیکھ تو اترا ہے کہاں شاہ کا لشکر — کہیو قدم پاک کو آنکھوں سے لگا کر

شیریں کی ہے یہ عرض کہ اب آیئے مولا
لونڈی کو قریب آکے نہ ترسایئے مولا

شیریں کا شوہر قلعے سے نیچے اتر کر فوراً قافلے تک پہنچتا ہے۔ لیکن وہ جس تصور کو یہاں لے کے آیا تھا معاملہ اس کے برعکس نظر آتا ہے۔ وہ عمر سعد کے خیمے کہ نگہبانوں سے کبھی عون ومحمد کو پوچھتا ہے کبھی عابد بیمار کو کبھی علی اکبر، کبھی عباس کے خیمے کا پتہ پوچھتا ہے کبھی خیمہ ناموس کی ڈیوڑھی لیکن اس کی حیرت نامرادیوں میں بدل جاتی ہے جب اسے پتہ چلتا ہے کہ یہ لشکر حسین کا نہیں بلکہ قاتلان حسین کا ہے جو ناموس حسینؑ کو گرفتار کرکے لایا ہے۔ دیکھئے شیریں کا شوہر کیسے مناظر سے دو چار ہوتا ہے۔

سیدانیاں بیٹھی ہیں وہ چہرے پہ ملے خاک — زینب ہے وہی ماتمی پہنے ہوئے پوشاک
وہ بانوئے بے کس ہے گریبان کئے چاک — بیٹھی ہے وہ کلثوم بہن شاہ کی غم ناک

کبریٰ ہے وہ زانو پہ جھکائے ہوئے سر کو
وہ بالی سکینہ ہے جو روتی ہے پدر کو

ہم عرض کر چکے ہیں کہ انیسؔ کو بیانیہ کے فن میں مہارت حاصل ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ کہانی کو کلائمکس تک پہنچتے پہنچتے کس کس پیچ وخم سے گذرنا ہے۔ اس لئے وہ ہر آنے والے موڑ کے لئے کہانی کی ابتدا میں ہی فضا سازگار کرتے چلے جاتے ہیں۔ عقد کے وقت شیریں کی شرط زن وشوہر کے درمیان تفاوت کی مظہر ہے۔ انیسؔ شیریں کے شوہر کا جیسا کردار دکھلانا چاہتے ہیں کہانی کے آخر تک وہی کردار باقی رہتا ہے۔ چنانچہ شیریں کے اضطرار پر شوہر کا قلعے سے نیچے اتر کر لشکر تک آنا اور وہاں کا منظر دیکھ کر سر وسینہ پیٹتے ہوئے لوٹنا کردار کے مزاج کے عین مطابق نظر آتا ہے۔

کہانی کا اگلا موڑ نہایت اہم اور معنی خیز ہے۔ وہ کوہ الم جو شہادت حسین کی خبر سن کر شیریں پر گرا اس پر شیریں اور اس کے شوہر کا ردعمل انیسؔ کے بیانیے کا ایک اہم جز ہے۔ یہاں انیس تاریخ کی واقعیت پر قدم رکھے کھڑے ہیں اور انکا تخیل شیریں کا اضطراب اس کے شوہر کی سراسیمگی اور حسین کے بے یار و مددگار قافلے کی غیرت وحیا کو دیکھ رہا ہے۔ انیسؔ کے بیانیے کا فن اپنے قاری کو اس بزم غم میں لے جا کر کھڑا کر دیتا ہے۔

شیریں تھی جو یاں منتظر سبط پیمبر — رونے کا جو اک شور سنا ہوگئی ششدر
دیکھا کہ چلا آتا ہے سر پیٹتا شوہر — ڈیوڑھی پہ سراسیمہ نکل آئی کھلے سر
چلا کے کہا کس نے تمہیں لوٹ لیا ہے
جلدی ارے لوگو کہو یہ ماجرا کیا ہے

سر پیٹ کے تب شوہر شیریں یہ پکارا — بی بی ترے آقا کو ستمگاروں نے مارا
زہراؑ کا پسر خلق سے جنت کو سدھارا — سادات کا تو قافلہ لوٹا گیا سارا
بھیجا تھا جہاں تو نے وہ لشکر ہے شقی کا
سر کاٹ کے لائے ہیں حسین ابن علیؑ کا

تو منتظر اب کس کی ہے کون آئے گا بی بی   لد ہے سو بیمار ہے رانڈ یں ہیں سو قیدی
شیریں نے کہا پیٹ کے سر کوٹ کے چھاتی   ہے ہے میرے سید امیرے آقا، میرے والی

لٹوا کے گھر اور تیغ سے کٹوا کے سر آئے
فرمایا تھا آؤں گا سو یوں میرے گھر آئے

یہ کہہ کے چلی پیٹتی اور دیتی دہائی   رستے میں کہیں گر پڑی ٹھوکر کہیں کھائی
اک بار خبر آنے کی شیریں کے جو پائی   زینب نے کہا ہائے سلامت نہیں بھائی

پردے کو وہ آئی ہے سویاں گھر بھی نہیں ہے
منہ کا ہے سے ہم ڈھانپیں کہ چادر بھی نہیں ہے

انیس کہانی کو یہاں تک لا کر شیریں کے اس بین کو اجاگر کرتے ہیں جو وہ شہادت حسینؑ کے المیے پر قافلۂ اہل حرم میں آ کر کرتی ہے یہ بین فطرت وحقیقت سے اتنا نزدیک ہے کہ قاری خود کو کسی سانحے پر بین کرنے والی مستورات کے درمیان کھڑا ہوا محسوس کرتا ہے۔ شیریں بین کرتے کرتے اس نیزے کے پاس پہنچ جاتی ہے جس پر امام حسینؑ کا خون آلودہ سر رکھا ہوا ہوتا ہے۔ شیریں کبھی اپنی شہزادی کے بے وارث ہونے پر گریہ کرتی ہے۔ زنجیروں میں جکڑے ہوئے شہزادے کی خستگی پر فریاد کرتی ہے۔ کبھی اجڑی ہوئی گودوں کا ماتم کرتی ہے کبھی خود سر حسینؑ سے مخاطب ہو کر بین کرتی ہے۔

آقا تری اس خون بھری تصویر کے واری   میں مر نہ گئی ہائے بلا لے کے تمہاری
اس بین سے شیریں نے کی جو گریہ وزاری   نیزے پہ سر شاہ کے آنسو ہوئے جاری

پیدا یہ لب خشک سے حضرت کے صدا تھی
کیوں روتی ہے شیریں یہی مرضی خدا تھی

حسینؑ اپنے بریدہ سر سے شیریں کے لئے تشفی کے وہ کلمات ادا کرتے ہیں جو کردار حسینؑ کے مزاج کے عین مطابق ہیں۔ حسین کا سر ایسے عالم میں بھی حسینؑ کے صادق الاقرار ہونے اور عہد کے ایفا کرنے پر شکر ادا کرتا ہے۔ بین وبکا کے اس ماحول میں بریدہ سر خود اپنے

کنبے کے مظلوموں کی داستان دہرانے لگتا ہے۔ شیریں سے سر حسینؑ کا مکالمہ دیکھئے۔

زینب کی خبر لے کہ ہے قیدی مری خواہر — بنت اسداللہ کے سر پر نہیں چادر
ہے خاک سے کبریٰ نے چھپایا سر انور — شہزادی تری آج ہے بلوے میں کھلے سر

احسان کا یہ وقت ہے عبرت کی یہ جا ہے
وہ قیدی ہے جس نے تجھے آزاد کیا ہے

سیدانیوں کو چادریں کچھ لا کے اڑھا دے — رانڈوں کی مدد کر کہ خدا تجھ کو جزا دے
راضی ہوں نبی صاحب تطہیر دعا دے — محشر میں تجھے حلۂ فردوس خدا دے

بے وارث و والی ہیں گرفتار بلا ہیں
محتاج کفن ہم ہیں یہ محتاج ردا ہیں

صاحب عزا کنبے میں ایک نئے مہمان کے داخلے پر زینب کے زخم ہرے ہو جاتے ہیں۔ گریہ و شیون کی فضا ایک اور نیا رخ لے لیتی ہے۔ خود زینب سر حسین سے مکالمہ کرنے لگتی ہیں ؎

جیتی ہے بہن کس لئے کڑھتے ہو برادر — تن پر تو ہے سر کو مرے سر پر نہیں چادر
گردن پہ تو بہنا کے پھرایا نہیں خنجر — لاشہ تو مرا دھوپ میں جلتا نہیں دن بھر

غم کھاؤ نہ چادر جو نہیں پاتی ہوں بھائی
بالوں سے تو منہ ڈھانپے چلی جاتی ہوں بھائی

شیریں کا گریہ و شیون بڑھتا جا رہا ہے۔ یہاں شیریں کا کرب اور اس کا نالہ و گریہ قابل دید ہے ؎

زینب تو یہ کہتی تھی سر شاہ سے رو کر — چلاتی تھی شیریں کہ میں صدقے ترے سرور
ان آنکھوں کی تعریف کیا کرتے تھے اکثر — کیوں ہو نہ گئے کور مرے دیدۂ انور

ہوتیں نہیں سیر آپ کے دیدار سے آنکھیں
لاؤ تو ملوں چاند سے رخسار سے آنکھیں

یہاں بیانیہ کی قوت آپ نے ملاحظہ کی۔ شاید یہی کہانی کا کلائمکس ہوتا اگر یہ مرثیہ

انیسؔ کی تخلیق نہ ہوتا لیکن انیسؔ ایک مرثیہ نگار کی ذمہ داری نبھاتے ہوئے کہانی کے بیانیے کو بھی فوت نہیں ہونے دیتے اور مرثیے کو بھی دم نہیں توڑنے دیتے۔ انیسؔ کہانی میں ایک اور موڑ لے آتے ہیں جو روایت اور تاریخ دونوں کو ساتھ لے کر چلتا ہے۔ شریں عمر سعد کے لشکر کو زرومال کا لالچ دے کر سر حسینؑ اور اسیران حرم کو اپنے یہاں ایک شب مہمان رکھنے کی اجازت حاصل کر لیتی ہے۔ اور اہلبیت حسینؑ ایک شب کے لئے شیریں کے گھر مہمان ہو جاتے ہیں۔ کہانی قاری کو ایک اور نئی بزم میں لے جاتی ہے۔ جہاں مدت سے آلام و مصائب میں گرفتار حسینؑ کا غیور گھرانہ ایک ہمدرد اور عقیدت مند کے گھر میں قیام کرتا ہے۔ اپنی وضع داریوں اور غیرتوں کے ساتھ ایک کنیز کے گھر میں قدم رکھتے ہوئے خانوادۂ رسالت کے افراد جس عسرت و زبوں حالی کی کیفیات سے دوچار ہوتے ہیں انیسؔ کی تخیل انھیں اس طرح اپنے لفظوں میں ڈھال لیتی ہے۔

چلاتی تھی بانو مرے سید مرے سرور — شیریں کے گھر آئے مجھے اس حال میں لے کر
لپٹی ہوئی کہتی تھی سر شاہ سے خواہر — مہمان بہن آئی ہے سر پر نہیں چادر

غیرت سے موئی جاتی ہے صدمہ ہے بہن پر
ثابت نہیں کرتا بھی سکینہ کے بدن پر

حسینؑ اور ان کے اہلبیت کی تواضع کے لئے شیریں نے جو کھانے اپنے گھر تیار کرائے تھے وہ اہلبیت سے ان پر حسینؑ کی فاتحہ دینے کی درخواست کرتی ہے۔ عابد بیمار فاتحہ دیتے ہیں۔ رانڈوں میں ایک کہرام برپا ہوجاتا ہے۔

ایسے عالم میں یتیموں کے یہ بین دیکھئے۔

روکر کہا زینب نے بہن ہوگئی واری — میں جیتی ہوں اور فاتحہ ہوتی ہے تمہاری
کیا پیاس تھی جس دم تھا لہو زخموں سے جاری — پانی نہ کسی نے دیا مانگا کئی باری

جب تم تھے تو ملتا تھا نہ پانی کہیں بھائی
اب پانی تو موجود ہے اور تم نہیں بھائی

روتی ہوئی اتنے میں اٹھی بانوئے بے پر — اک دودھ کا کوزہ رکھا اک پانی کا ساغر
سجاد سے رو رو کے کہا اے مرے دلبر — ان دونوں پہ دو فاتحۂ اکبر واصغر

مارے گئے کس ظلم وجفا سے مرے بچے
تھے تین شب وروز کے پیاسے مرے بچے

وہ ضبط گریہ جو ابھی ہم کہانی میں سید سجاد سے دیکھتے آئے ہیں۔شیریں سے حسین کی فاتحہ دلانے کی پیش کش پر اس کا باندھ بھی ٹوٹتا نظر آتا ہے۔ایک موت کے گھر میں جہاں وقت نے دھیرے دھیرے شور گریہ کو کم کردیا تھا اچانک ایک بار پھر مرنے والوں کی یادیں تازہ ہوجاتی ہیں اور بین وبکا کی صدائیں بلند ہوجاتی ہیں یہاں یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ یہ وہ عزادار ہیں جن پر قتل حسین کے بعد سے لے کر گریہ وشیون پر پابندی بھی تھی اور جو کسی ہمدردی جتانے والے کی عدم موجودگی کے احساس سے بھی دوچار تھے۔اب کہانی میں ایک ایسا کردار داخل ہوچکا ہے جس کی بدولت ایک شب کے لئے گریہ وشیون سے پابندی بھی اٹھ گئی ہے اور جو اس مجلس شیون میں انکا ہمدرد بن کر ان کا شریک بھی ہے۔

فاقہ شکنی کا جو اسیروں نے سنا نام — پیٹے یوں سروسینہ کہ برپا ہوا کہرام
زینب نے کہا کھانے کا ہے کون سا ہنگام — نے چین محمد کو نہ زہرا کو ہے آرام

کیا کھانے کو ہم کھائیں کہ دل غم سے بھرا ہے
لاشہ تو ابھی بھائی کا جنگل میں پڑا ہے

بھائی تو ہے بے گوروکفن کھاؤں میں کھانا — بے دفن ہو فرزند حسن کھاؤں میں کھانا
بے سر علی اکبر کا ہو تن کھاؤں میں کھانا — پامال ہو زہرا کا چمن کھاؤں میں کھانا

رونا مجھے دیکھے سے چلا آتا ہے لوکو
لے جاؤ کہ کھانا مجھے یہ کھاتا ہے لوکو

ناچار ہو اک جام کو شیریں نے اٹھایا — پاس آن کے ہونٹوں سے سکینہ کے لگایا
بولی کہ پیو اری دم آنکھوں میں ہے آیا — منہ پھیر کے شیریں کو سکینہ نے سنایا

پیاسے مرے بابا ہوئے میں بھی نہ جیوں گی
عباس چچا آئیں گے جب پانی پیوں گی

شیریں کی فاقہ شکنی کی یہ درخواست اسیروں کے زخموں کو کرید دیتی ہے۔ قیدیوں کا یہی کہرام مرثیے کو اختتام تک پہنچاتا ہے کہانی کے اختتام تک پہنچتے پہنچتے انیسؔ نے ایک اجڑے ہوئے گھر کے کہرام کو جس سچائی اور فطری پن کے ساتھ قاری کے سامنے پیش کیا ہے وہ انیسؔ کے بیانیے کا خاص حصہ ہے۔ جہاں انیس نے ایک ایک فرد کی زبان سے ایک ایک مصرعے میں اپنے اپنے عزیز کا مکمل مرثیہ کہلوا دیا ہے۔

انیسؔ نے جس فضا میں مرثیے کا آغاز کیا ہے وہاں سے کہانی کئی موڑ لیتی ہوئی اختتام تک پہنچتی ہے۔ یہ پیچ وخم ایسے نازک تھے کہ کسی بھی موڑ پر کہانی کار کے بہک جانے یا بھٹک جانے کا خطرہ بنا ہوا تھا لیکن کہانی کے کس موڑ پر ٹھہرنا ہے۔ کس موڑ سے سرسری گزر جانا ہے۔ کہاں اختصار سے کام لینا ہے۔ کہاں تفصیل سے۔ انیسؔ اس رمز سے خوب واقف ہیں۔ جہاں ٹھہرنا ضروری ہے وہاں انیسؔ ٹھہرے ہیں۔ جہاں نگاہ ڈال کر گذر جانا تھا وہاں انیسؔ نگاہ ڈال کر گذر گئے ہیں۔ تا کہ کہانی کا اصل مقصد بھی فوت نہ ہو۔ کہانی کا تجسس اور دلچسپی بھی کم نہ ہونے پائے۔ کہانی کا کلائمکس کہاں اور کس طرح ہونا چاہئے اور اس کا تقاضہ کیا ہے سب پر انیسؔ کی مکمل دسترس ہے۔ اکثر کہانیوں میں دیکھا گیا ہے کہ راستے کے پیچ وخم میں الجھ کر منزل کھو جاتی ہے۔ کہیں اختصار کہانی کی معنویت کا قاتل بن جاتا ہے کہیں تفصیل۔ انیسؔ جیسا ماہر کہانی کار ان سارے عناصر کو نگاہ میں رکھ کر کہانی کو آگے بڑھاتا ہے۔ کلائمکس تک پہنچنے کے لئے اسے جن اسباب وعلل کی ضرورت ہے اس کے لئے وہ کہانی کی ابتدا سے ہی فضا سازی میں مصروف نظر آتا ہے۔ کس کردار کو کہاں کس وقت منظر میں داخل ہونا ہے۔ کس کردار کو کب اور کہاں منظر سے باہر ہوجانا ہے۔ اس کی پوری احتیاط انیسؔ کے یہاں پائی جاتی ہے۔ کس کردار سے کیا کام لیا جانا ہے اس کردار کے مزاج اور اس کی

نفسیات کی وضاحت میں انیسؔ سے زیادہ ماہر فنکار کون ہوگا؟ انیسؔ نے کہیں بھی بڑوں سے چھوٹوں کے اور چھوٹوں سے بڑوں کے، آقا سے غلام کے اور غلام سے آقا کے کام نہیں لئے ہیں۔ کس کردار کی زبان پر کون سے فقرہ جچتا ہے۔ کہاں مکالمے کا کیا انداز ہونا چاہئے۔ انیسؔ سب جانتے ہیں چنانچہ کسی ظالم سے شریفانہ فقرہ یا کسی محترم شخصیت سے عامیانہ گفتگو انیسؔ کے یہاں نہیں پائی جاتی۔ انیسؔ کردار کو اس کام کی مناسبت سے مزاج اور نفسیات بخشتے ہیں۔ جو کردار تاریخی حیثیت رکھتے ہیں ان کے مزاج اور انکی نفسیات کو سامنے رکھ کر ہی انیسؔ نے مکالمے اور منظر نامے تخلیق کئے ہیں۔ انیسؔ نے جہاں روایت کو تاریخ پر حاوی نہیں ہونے دیا ہے وہیں تاریخ کو تاریخ کی طرح خشک اور بے روح بھی نہیں بنادیا ہے بلکہ اس میں اپنے بیانیے کی قوت سے کہانی کا حسن پیدا کردیا ہے۔ کمال یہ ہے کہ انیسؔ کی کہانی پر تاریخ کی صداقتوں کی مہر اور انیسؔ کے بیان کردہ تاریخی واقعے پر کہانی کی دلکشی کا گمان گذرتا ہے۔ یہی انیس کی کہانی کا فنیہ۔ یہی انیسؔ کے بیانیے کی عظمت ہے جو انہیں اس فن کا تاجدار بنادیتی ہے۔

سید عابد حسین عابدؔ کراروی

تقلید واجتہاد

ایٹم شکن ہے آج بھی تقلید و اجتہاد　　لرزاں ہے خوف و رعب سے دنیائے الحاد
شمشیر علم فقہ سے کاٹے سرعناد　　مسجد کی درسگاہ بنی لشکر جہاد
صدر فقیہ قلعۂ فولاد بن گیا
طوسی حصیر علم کی بنیاد بن گیا

اب بھی کھلا ہوا ہے درعلم و اجتہاد　　باب قیاس پہ ہیں لگے قفل انسداد
دریائے علم میں نہیں ہوتا ہے انجماد　　طوفان جہل میں نہ رکی کشتی سواد
بحر العلوم نہر دروس مفید بھی
ہے موجزن تفقہ خون شہید بھی

جرح و قروح حضرت یعقوب کی قسم　　زخم جبیرہ دل ایوب کی قسم
احکام حل عقدہ معیوب کی قسم　　خوں کے قصاص دیت مضروب کی قسم
دنیا و دیں کے جملہ مسائل وسیع ہیں
ابواب فقہ دیکھئے لکھے جمیع ہیں

تمباکو کو حرام کیا وہ فقیہ تھا　　رشدی کو حکم قتل دیا وہ فقیہ تھا
اور دہیریت کو کفر کہا وہ فقیہ تھا　　عیسائیت سے ڈٹ کے لڑا وہ فقیہ تھا
غیبت میں گر فقیہوں کا ہوتا نہ انصرام
مٹ جاتا کائنات سے اسلام کا نظام

یہ ہیں ولی امر ولایت کی مہر ہے　　تقلید واجتہاد پہ عصمت کی مہر ہے
آیات کردگار ہیں آیت کی مہر ہے　　ہیں جملہ اختیار امامت کی مہر ہے

قرآن و اہلبیت کی تفسیر ہوگئی
منبر پہ جب فقیہ کی تقریر ہوگئی

شبہات آئینہ ہوئے کشف الکلام کے — دامن میں بھر لئے ہیں جواہر کلام کے
لیتے رہے ہیں کام قلم سے حسام کے — کرتے رہے جہاد رسالے امام کے

مقتل تمام علم کا میدان بن گیا
اک مدرسہ دمشق کا زندان بن گیا

ایراں ہے کربلائے حسینی سے اکتساب — زندہ مثال امام خمینیؒ کا انقلاب
خون شہید پاک سے لکھی گئی کتاب — ہے انقلاب باب طہارت کا ایک باب

ایران پاک ہوگیا اتنا لہو بہا
تخت نجس بہاومیں طوفاں کے بہہ گیا

تاریخ اجتہاد نہایت قدیم ہے — مفتی حق و صدق خدائے علیم ہے
عہد فقیہ عہد رسول کریم ہے — گلشن میں ہر امام کے اس کی شمیم ہے

مسجد کو صادقین نے حوزہ بنا دیا
فقہ و اصول فقہ کا نقشہ بنادیا

یعقوب مرتضٰی کوئی عالی حسب نسب — کوئی علی ، حسین کوئی ، کوئی روح رب
تھا زین العابدین کوئی باقر الملقب — سلمان فارسی کوئی علامۂ عرب

ہر اک فقیہ قلعہ اسلام بن گیا
ہر مجتہد رسالہ احکام بن گیا

شاعر بھی ہے ادیب بھی ہے مجتہد مرا — نقاد بھی حکیم بھی سیاس بھی ہوا
ماہر ہے یہ علوم جدید وقدیم کا — تاریخداں محدث فرمان مصطفٰے

سرچشمہ علوم ہے سینہ فقیہ کا

طوفاں میں بھی چلا ہے سفینہ فقیہ کا

ہر ایک اجتہاد کا مسلک ہے جعفری — منہاج فقیہات کا منہج ہے موسوی
فتوے میں ہے رضائے محمد کی پیروی — کرتے ہیں مجتہد کی مدد حضرت تقی

عہد نقی میں بھی نہیں عنقا ہوا فقیہ
دور حسن سے تابہ ابد ہے مرا فقیہ

کچھ باغیان علم ہیں نوکر یہود کے — ہجو فقیہ اور شاگرد یہود کے
کلمہ میں رہ کے چلتے ہیں ساغر یہود کے — پاونڈ ہیں نصاریٰ کے ڈالر یہود کے

کعبہ میں جسم ، روح ہے کاخ سفید میں
آزادی ضمیر بھی ہے ری کی قید میں

کرتے ہیں اجتہاد کہ باطل ہے اجتہاد — کیا فریب کذب ہے کیا ہے حسیں تضاد
ہے ادعائے علم بھی اور علم سے عناد — ٹوٹے گا ایک دن یہ ترا خامہ فساد

دنیائے ظلم وجور کو بھر دے گا عدل سے
مظلوم کے لہو کا عوض لے گا عدل سے

نافذ رہے گا حکم حضور امام تک — یہ سلسلہ رہے گا ظہور امام تک
جاتے ہیں پوچھنے کو قبور امام تک — ہے ان کا دخل باب قصور امام تک

عابد ہمیشہ کھلتے رہیں در علوم کے
تا حشر ابلیں چشمہ جعفر علوم کے

رضوان بنارسی

عرفان غدیر

کیسے چھپے گا روئے منور غدیر کا
ضامن ہے خود ہی خالق اکبر غدیر کا

کاغذ پہ جیسے لکھی ہوں قرآں کی آیتیں
یوں نقش نام ہے میرے دل پہ غدیر کا

کس میں ہے دم جو روک دے اعلان کبریا
دنیا میں آج جشن ہے گھر گھر غدیر کا

کرتے ہیں جو بھی عظمت مولا سے انحراف
تحریر کرسکیں گے نہ منظر غدیر کا

چودہ صدی کے بعد بھی باقی ہے ہمہمہ
دنیا میں بے مثال ہے منبر غدیر کا

اب دشمن غدیر کی شاید نہیں ہے خبر
انگڑائی لے رہا ہے سمندر غدیر کا

امید اپنے حق میں تھی جن کو بہت قوی
کرتے رہے طواف وہ دن بھر غدیر کا

پیدا نہ انقلاب کوئی فرق کرسکا
اب تک اسی طرح ہے گل تر غدیر کا

جانا جسے ہو جائے وہ یہ بزم چھوڑ کر
ہم تذکرہ کریں گے برابر غدیر کا

اک لاکھ حاجیوں کا ہے مجمع بفضل حق
اعلان کر رہے ہیں پیمبر غدیر کا
چودہ صدی گزر گئی اب تک نہ ہو سکا
پیدا جہان میں کوئی ہمسر غدیر کا
دل کھول کے پی لوں گا مگر اتنی شرط ہے
دست طلب میں دو میرے ساغر غدیر کا
رضوان خلد کرتا ہے اٹھ کر اسے سلام
ملتا ہے جب بھی کوئی مخمور غدیر کا